سیّد وقار عظیم (۱۹۰۹ء — ۱۹۷۶ء)، اُردو تنقید اور تحقیق کا ایک بہت ممتاز، مقبول اور معتبر نام ہے —— فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعض قابلِ ذکر مصنفین کے ادبی کارناموں سے متعلق، یہ تنقیدی اور تحقیقی کتاب پیش کرتے ہوئے میں کسی بہت تفصیلی تمہید، تحسین یا تجدید کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ایک اہم ادبی تحریک اور موضوع پر عہدِ موجودہ کے ایک نامور نقاد کی یہ غیر مطبوعہ کتاب پہلی بار شائع ہو رہی ہے، اسی میں اس کی افادیت، اہمیت اور ندرت مضمر ہے —— مجھے یقین ہے کہ سیّد وقار عظیم کی یہ کتاب، اُن کی یاد کو نئی نسل کے دلوں میں، تازہ، روشن اور مستحکم تر کرے گی اور بجائے خود قبولِ عام پائے گی۔

—— ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

فورٹ ولیم کالج

تحریک اور تاریخ

تالیف:
پروفیسر سید وقار عظیم

ترتیب، تعارف، تعلیقات:
ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

یونیورسل بکس
۳۰ - اے بی، اُردو بازار، لاہور (پاکستان)

فورٹ ولیم کالج
تحریک اور تاریخ

نومبر ۱۹۸۶ء

یُونیورسل بکس،

۲۴، اے، اُردو بازار، لاہور

طابع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

قیمت : ۳۵ روپے

ترتیب :

وقار عظیم صاحب کے مدّاح اور ممدوح

اور

اپنے اُستاد اور محسن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

کے نام

معین

"..... یہ الگ بات ہے کہ سیّد وقار عظیم صاحب کسی اعزاز کے محتاج نہ تھے اُن کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ اُن کے شاگرد اور مدّاح اور پڑھنے والے اور "اُردو ادب" اور "ایشیائی تاریخ" اُنھیں دلی محبت کے ساتھ مدتوں یاد کرتے رہیں گے۔ انسان کا سب سے بڑا اعزاز وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائے ۔۔۔"

جمیل الدّین عالی

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن :

منصبی مصروفیت : پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور

دیگر علمی اور تہذیبی مشاغل :

۱۔ ممبر مجلسِ قائمہ اُردو کمیٹی برائے ذریعۂ تعلیم، حکومتِ پنجاب، لاہور
۲۔ ممبر مجلسِ علمی، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور
۳۔ ممبر منتظمہ، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور
۴۔ ایڈوائزر (اُردو)، پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور
۵۔ ممبر اسکرپٹ کمیٹی، لاہور آرٹس کونسل، لاہور
۶۔ ممبر بورڈ آف اسٹڈیز (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۷۔ ممبر مجلسِ قائمہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
۸۔ جج صدارتی اقبال ایوارڈ، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد
۹۔ جج پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ، پشاور ۸۵-۱۹۸۳ء
۱۰۔ ممبر بک سلیکشن کمیٹی، قائدِ اعظم لائبریری، لاہور
۱۱۔ کنوینر، کمیٹی آف کورسز (اُردو) اعلیٰ و ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور
۱۲۔ ایڈوائزر، لیکچررز سلیکشن بورڈ (اُردو)، حکومتِ پنجاب، لاہور

مطبوعات و مرتبات :

۱۔ بابائے اُردو — احوال و افکار: طبع اوّل، کراچی ۱۹۶۴ء، باضافہ و ترمیم، لاہور ۱۹۷۶ء، طبع سوم: دہلی، سری نگر، گورکھپور، لکھنؤ، بمبئی ۱۹۷۹ء، طبع جدید، لاہور ۱۹۸۲ء

۲۔ سیّد وقار عظیم — سوانحی خاکہ[1]: لاہور ۱۹۷۶ء، اشاعت اوّل، کراچی ۱۹۸۰ء

---

[1] "سیّد وقار عظیم — سوانحی خاکہ" پر ثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام دو ہزار روپے عطا کیا۔

۳۔ نقدِ عبدالحق: لاہور، ۱۹۶۸ء

۴۔ خیالستان (یلدرم): طبع اول، لاہور/کراچی، ۱۹۶۸ء، باضافہ و ترمیم لاہور ۱۹۷۶ء
باضافہ و ترمیم، لاہور ۱۹۸۳ء

۵۔ اشاریۂ غالب[۱]: لاہور، ۱۹۶۹ء

۶۔ آپ بیتی — رشید احمد صدیقی[۲]: طبع اول، لاہور، ۱۹۷۰ء، طبع دوم، لاہور ۱۹۷۴ء
طبع سوم، دہلی، بمبئی، ۱۹۷۷ء، باضافہ و ترمیم لاہور ۱۹۸۰ء، طبع جدید لاہور ۱۹۸۳ء

۷۔ مطالعۂ یلدرم[۳]: لاہور، ۱۹۷۱ء

۸۔ غالب اور انقلاب ستاون[۴]: طبع اول، لاہور ۱۹۷۴ء، باضافہ و ترمیم لاہور ۱۹۷۶ء

۹۔ ذکرِ عبدالحق: لاہور ۱۹۷۵ باضافہ و ترمیم، طبع دوم، لاہور ۱۹۸۵ء

۱۰۔ قائدِ اعظم اور لائل پور: لاہور ۱۹۷۶ء

۱۱۔ دیوانِ غالب (ترتیب): طبع اول، لاہور ۱۹۷۹ء، باضافہ و مقدمہ، زیرِ طبع۔

۱۲۔ جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ: لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۳۔ اقبالیات کا مطالعہ (سید وقار عظیم)، لاہور ۱۹۷۷ء

۱۴۔ فرموداتِ عبدالحق[۵]: لاہور ۱۹۷۸ء

۱۵۔ تحقیقِ غالب: کراچی، لاہور ۱۹۸۱ء

۱۶۔ محمد نقوش: ملتان، ۱۹۸۳ء

۱۷۔ فورٹ ولیم کالج (سید وقار عظیم): لاہور ۱۹۸۶ء

۱۸۔ نثری ادب (ٹیکسٹ بک بی-اے، اردو): پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۸۹ء

۱۹۔ غالب کا علمی سرمایہ: کراچی، زیرِ طبع۔

مستقل پتا: "الوقار" ۵۰۔ لوئر مال، لاہور۔۱

---

[۱] اشاریۂ غالب پر ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام تین ہزار روپے عطا کیا۔
[۲] یہ کتاب ثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا کے عالمانہ تحقیق و تصنیف کے اعزاز برائے ۱۹۸۰ء کے لیے منتخب ہوئی۔
[۳] مطالعۂ یلدرم پر ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا انعام، پانچ ہزار روپے عطا کیا۔
[۴] غالب اور انقلاب ستاون پر ۱۹۷۳ء کا داؤد ادبی انعام، پانچ ہزار روپے عطا کیا گیا۔
[۵] فرموداتِ عبدالحق پر ثانوی تعلیمی بورڈ، سرگودھا نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق کا انعام برائے ۱۹۷۸ء عطا کیا۔

عرضِ مرتب:

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

اردو میں تنقید کے سلسلے کی پہلی باقاعدہ کاوش حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" (۱۸۹۳ء) یکسر، ادب کے صرف ایک شعبے: 'شعر و شاعری' سے بحث کرتا ہے۔ مقدمے کی اشاعت کے کوئی بیس برس بعد ۱۹۱۴ء میں حالی کا انتقال ہوا، اس وقت تک اردو تنقید 'شعر و شاعری' ہی تک محدود تھی۔ 'نثر اور نثر نگاری' یا 'اصنافِ نثر' کی تنقید کی طرف توجہ، حالی کے انتقال کے بھی دس بیس برس بعد کا واقعہ ہے۔

سید وقار عظیم کی کتابوں: 'افسانہ نگاری' اور 'ہمارے افسانے' (۱۹۳۴ء) کا شمار، اردو میں 'نثری تنقید' یا 'فکشن کریٹی سزم' کی اولین عملی کوششوں میں ہوتا ہے۔ وقار عظیم صاحب، فکر و نظر کی اس صف کے اکابرین میں ہیں جنہوں نے اس صدی کے چوتھے دہے میں اردو تنقید کو شعر کی حدود سے آگے بڑھایا اور اسے اپنے اظہار کے لیے نثر کی ایک نئی جولاں گاہ سے ہم کنار کیا — حالی، اردو کی شعری تنقید کے قافلہ سالار ہیں تو وقار عظیم، اردو میں نثری اصناف کے اولین نقادوں، معماروں اور معیار سازوں میں سے ہیں۔ جس طرح اردو میں 'شعر و شاعری' کی تنقید میں حالی کی اولیت اور فضیلت مسلّم ہے، اسی طرح اردو تنقید کو 'نثر اور نثر نگاری' کا وسیع تر میدان فراہم کر دینا، وقار عظیم کا ایک نمایاں امتیاز ہے۔ انہوں نے اردو

میں فنِ تنقید کو نیا موڑ عطا کیا اور اُسے نئے میلان اور وسیع تر امکانات سے دوچار کیا۔

اُردو تنقید کو نثر سے نثر کی طرف لانے کے تاریخ سازوں سے قطع نظر، سید وقار عظیم کی تنقید بجائے خود اپنی تازگی، شگفتگی، خوش بیانی اور بحیثیت مجموعی اپنی تدبیر کاری اور منطقی خوداستدلالی کی بنا پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے، جسے اپنے ’اندازِ قد‘ کے باعث بہتوں میں اور بہت دور ہی سے پانا اور پہچاننا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا، اور یہ کچھ کم اہم امتیاز نہیں ۔۔۔ اُنہوں نے ایک موقع پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بارے میں لکھا ہے کہ :

”اُن کی تنقید و تحقیق کی بنیادی خصوصیت منطقی خوش استدلالی ہے۔ منطق، اگر خوش استدلال نہیں تو اس کا عدم وجود برابر ہے۔ سچی، صحیح اور دیانت دارانہ تحقیق و تنقید کا راستہ ہی خوش استدلالی کا راستہ ہے اور یہ بات ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تحریروں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

فرمان صاحب، بات ایک چھوٹے سے دعوے سے شروع کرتے ہیں۔ اس دعوے کی صداقت کے اثبات میں صاف، سیدھے اور واضح صغریٰ اور کبریٰ قائم کرتے ہیں اور ان سے ایک صریحی نتیجہ اخذ کرلیتے ہیں۔ یہ نتیجہ فوراً ہی ایک نئے منطقی قیاس کا مقدمہ بنتا ہے اور صغریٰ و کبریٰ کی ایک نئی ترتیب، کسی اور نتیجے کے استنباط کا ذریعہ بنتی ہے۔ مقدمات، مفرد اور مرکب قضیات کی ترتیب، قیاس، استخراج، استقراء، استنباط اور استنتاج کے کئی مرحلوں سے گزرتی ہوئی، یہ منطق بالآخر کسی ایسی دریافت کا سبب بنتی ہے جسے ادب کے مسلمات میں جگہ ملتی ہے۔ فرمان صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین نے منطق کے اسی انداز پر چل کر کئی ایسی باتیں دریافت کی اور کہی ہیں، جنہیں ادب کی دنیا میں اعتبار کا درجہ ملا ہے۔

منطق کے جن مرحلوں کا ذکر میں نے فرمان صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے سلسلے میں کیا، اُن میں بڑی سبک رفتاری سے اُبھرنے اور آگے بڑھنے والی تمثیل کی کیفیت ہے، جو شوق اور تجسس کو اُبھارتی، ذہن کو شک و یقین کے

زیر و بم سے گزارتی، ایک ایسے انجام تک پہنچتی ہے جو پڑھنے والے کے لیے قابلِ قبول ہو۔ فرمان صاحب کے منطقی استدلال کا ایک اور وصف لہجے کی ایسی متانت اور بردباری ہے جس نے شگفتہ روی اور دل داری کو ہمیشہ اپنا رفیق اور دمساز بنایا ہے۔ اُن کی تحقیق اور تنقید نے دیانت دارانہ اور محبت آمیز وکالت کو اپنا وظیفہ بنایا اور ہمیشہ خوش بیانی سے اسے پورا کیا ہے۔“

یہ باتیں جو وقار عظیم صاحب نے فرمان صاحب کے بارے میں کہی ہیں خود وقار عظیم صاحب کے تنقیدی رویّے اور روش اور اُن کے خوش لہجہ تجزیاتی اسلوب اور مسلک پر منطبق ہوتی ہیں اور اسی شدت سے بہ آسانی بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ وقار عظیم صاحب کے تحقیق آمیز تنقیدی سرمائے کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔

سید وقار عظیم (۱۹۰۹ء - ۱۹۷۶ء)، اُردو تنقید اور تحقیق کا ایک بہت ممتاز مقبول اور معتبر نام ہے۔ اُن کی دسویں برسی (۱۷۔ نومبر ۱۹۸۶ء) کے موقع پر فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعض قابلِ ذکر مصنّفین کے ادبی کارناموں سے متعلق اُن کی زیرِ نظر تنقیدی (اور تحقیقی) کتاب پیش کرتے ہوئے میں کسی بہت تفصیلی تمہید، تحسین یا تمجید کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ایک اہم ادبی تحریک اور موضوع پر عہدِ موجودہ کے ایک نامور نقاد کی یہ غیر مطبوعہ کتاب، پہلی بار شائع ہو رہی ہے، اسی میں اس کی افادیت، اہمیت اور ندرت مضمر ہے۔

۱۹۵۰ء کے اوائل میں وقار عظیم صاحب، پنجاب یونیورسٹی (اورینٹل کالج، لاہور) کے شعبۂ اُردو سے وابستہ ہوئے ۔۔۔ ایک موقع پر خود اُنہوں نے بتایا ہے کہ ”یونیورسٹی میں یہاں میرے سپرد فکشن اور اقبالیات کے پرچے تھے۔ اس لیے زیادہ کوشش یہی رہتی کہ انھیں چیزوں کا مطالعہ کیا جائے جو طلبا کے لیے مفید ثابت ہوسکیں، چنانچہ ان موضوعات پر نئی پرانی سب چیزیں نظر سے گزرتی رہیں۔ زیادہ تر انھیں موضوعات پر لکھا بھی۔“[1]

فروری ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی میں جن پرچوں کی تدریس وقار عظیم صاحب کے سپرد ہوئی اُن میں فکشن کا پرچہ داستان، ناول، افسانے اور ڈراما کی تنقید و تاریخ اور ان اصناف کے

---

[1] سید وقار عظیم — سوانحی خاکہ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۷ء (۱۹۸۰ء)، ص ۴۹

نمائندہ کلاسیکی منتخبات کے متن پر مبنی تھا۔ فکشن کی تنقید اور تاریخ اُن کا مدت العمر کا شغف تھا ہی، نئی تدریسی ذمہ داری نے مہمیز کا کام کیا اور اردو داستان کے حوالے سے انھوں نے فورٹ ولیم کالج کی تحریک اور تاریخ اور اس دور کے تصنیفی سرمائے کے بارے میں اپنے مطالعے کو تازہ کیا، اور اپنے اس منضبط مطالعے کے نتائج، مرتب صورت میں جمع کیے۔ یہی جمع جتھا، پیشِ نظر کتاب کی بنیاد بنا۔

فورٹ ولیم کالج کے بارے میں وقار عظیم صاحب کی یہ کتاب خود اُن کے قلم سے لکھی ہوئی میرے ذاتی ذخیرۂ نوادر میں محفوظ ہے۔ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھا گیا ہے۔ مسودہ کل ۱۰۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ ہر ورق کے ساڑھے چھ انچ × نو انچ سائز پر بالعموم ۲۳، ۲۴ سطریں آئی ہیں۔ قلمی مسودے کے اوراق نمبر ۹ اور نمبر ۱۰۴ کا عکس تبرکاً شائع کیا جا رہا ہے۔

کتاب کا یہ قلمی مسودہ وقار عظیم صاحب نے اپنے کاغذوں اور کتابوں وغیرہ کی چھٹائی کے بعد اپنے بعض دیگر متفرق مسودات، یادداشتوں اور تراشوں اور اپنے نام موصولہ بہت سے مکتوبات وغیرہ کے ساتھ، ۱۹۷۳ء میں مجھے مرحمت کیا۔ مسودے پر ایسا کوئی اندراج نہیں جس سے حتمی طور پر اس کا زمانۂ تالیف متعین کیا جا سکے۔ بعض داخلی شہادتوں سے اس ضمن میں ضرور کچھ مدد ملتی ہے۔

"باغ و بہار" کا ذکر کرتے ہوئے ایک موقع پر انھوں نے لکھا ہے کہ میرامّن کی خودساختہ ترکیبوں میں سے اکثر ایسی ہیں کہ ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی ان میں اجنبیت نہیں پیدا ہوئی —" (قلمی مسودہ، ورق ۲۰) — "باغ و بہار" ۱۸۰۳ء میں پہلی بار چھپی۔ اس "ڈیڑھ سو برس گزر جانے" کے معنی ہیں کہ بات ۱۹۵۳ء یا اس کے لگ بھگ کہی جا رہی ہے۔ کتاب میں "شمالی ہند کی اُردو نثری داستانیں" کا کئی جگہ حوالہ آیا ہے۔ اس نام اور عنوان سے ڈاکٹر گیان چند کی کتاب ۱۹۵۴ء میں چھپی۔

کتاب کے حواشی میں وقار عظیم صاحب نے اپنی کتاب "ہماری داستانیں" (شائع کردہ ادارۂ فروغِ اُردو، لاہور) کا ایک دو مواقع پر حوالہ دیا ہے جو ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ کتاب میں مولانا حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخِ اُردو" (طبع دوم، آگرہ ۱۹۵۷ء) سے

استفادے کی شہادت بھی موجود ہے، ۱۹۵۷ء سے بعد کے کسی ماخذ کا حوالہ کتاب میں نہیں آیا۔ اس بنا پر میں قیاس کرتا ہوں کہ یہ مسودۂ کتاب ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء کے لگ بھگ کبھی صورت پذیر ہوا۔

وقار عظیم صاحب کی یہ کتاب، اب سے تقریباً تیس برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ اُس وقت تک فورٹ ولیم کالج کے بارے میں دو چار ماخذ ہی معلوم تھے، یہاں تک کہ محمد عتیق صدیقی کی کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" بھی، جو آج اس موضوع پر ہمارے مطالعے کے ایک جزوِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے، اُس وقت تک نہیں آئی تھی۔ پچھلے پچیس تیس برسوں میں فورٹ ولیم کالج اور اس کے نثری کارناموں یا مصنّفین کے بارے میں اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی بڑا قابلِ قدر کام ہوا ہے جس سے قدرتی طور پر، کتاب کے متن میں فائدہ نہیں اُٹھایا گیا۔ حواشی میں، میں نے تازہ مصادر کی طرف اشارے کر دیے ہیں تاکہ کتاب زیادہ سے زیادہ مفید اور معتبر ٹھہرے۔

کتاب کے بعض مقامات، کسی اگلی فرصت کے لیے مُعرّیٰ چھوڑ دیے گئے تھے۔ میں نے یہ خانہ پُری کر دی ہے۔ مثلاً: مسودے کے ورق ۲۴ پر ایک جگہ وقار عظیم صاحب نے لکھا ہے کہ "— اس واقعے کا ذکر تحسین نے ان الفاظ میں کیا ہے:" لیکن اس محل پر تحسین کے الفاظ مُبیّضے میں درج نہیں۔ میں نے تحسین کی "نوطرزِ مرصّع" سے متعلقہ عبارت فراہم کر دی ہے۔

اسی طرح مثلاً مسودے کے ورق ۲۵ کے حاشیے میں وقار عظیم صاحب نے لکھا ہے کہ "— اس محل پر میرامّن کے معروف معاصر داستان گو حیدر بخش حیدری کے وہ الفاظ جو انھوں نے "آرائشِ محفل" کے دیباچے میں لکھے ہیں قابلِ توجّہ ہیں:" لیکن یہاں "آرائشِ محفل" کے الفاظ درج نہیں ہوئے۔ میں نے یہ الفاظ اقتباس کر دیے ہیں۔ یا مثلاً مسودے کے ورق ۵۵ پر وقار عظیم صاحب نے لکھا ہے کہ:

"باغِ اُردو" چونکہ عام طور سے دستیاب نہیں، اس لیے اس کے دو تین اقتباس درج ذیل ہیں۔ ان اقتباسات سے "باغِ اُردو" اور شیر علی افسوس کے اسلوب

کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی"۔

اور اس کے بعد ورق ۵۵ کا نصف آخر اور ورق ۵۶ تمام کا تمام خالی چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے یہاں اپنی صوابدید پر 'باغِ اُردو' سے دو تین اقتباس منتخب کر کے انہیں خالی اوراق میں بڑھا دیا ہے۔

بعض صورتوں میں تائیدی یا توضیحی اقتباسات یا حوالے ناقص یا نا تمام رہ گئے تھے۔ میں نے بساط بھر کوشش کی ہے کہ ضروری تکمیل ہو جائے۔ یہاں یہ وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ وہ ذیلی حواشی جو لفظ (مرتب) سے ممیز ہیں، میرا اضافہ ہیں، اس کے علاوہ حواشی میں جو کچھ ہے، اُسے بمنزلہ بیانِ مؤلف تصور کیا جائے۔

"گلکرسٹ کی ایک تالیف" کے عنوان سے سید وقار عظیم کا ایک مختصر سا مضمون 'اُردو ڈائجسٹ'، لاہور (سالنامہ ۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا تھا جو فورٹ ولیم کالج کی ایک مطبوعہ کتاب "نقلیات" کے بارے میں ہے۔ دو برس بعد ۱۹۶۶ء میں مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور کی جانب سے وقار عظیم صاحب کی مرتبہ کتاب "نقلیات" شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمے میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ "نقلیات" کے مؤلف کے بارے میں اظہارِ خیال کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے مؤلف گلکرسٹ نہیں بلکہ میر بہادر علی حسینی ہیں۔ یہ دونوں نگارشات اپنی معنوی اور تحقیقی اہمیت اور زیرِ نظر کتاب سے قریبی موضوعی مناسبت کے پیشِ نظر آخرِ کتاب میں شامل کر لی گئی ہیں۔ "نقلیات" کا خیال افروز اور معنی خیز انگریزی اختتامیہ (POST SCRIPT) گلکرسٹ کے قلم سے ہے جو ہدفِ کار سے اُن کے گہرے انہماک اور دل سوزی پر منظر ہے۔ اس اختتامیے کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کرنے کی خدمت وقار عظیم صاحب نے انجام دی تھی، "اضافات" کے تحت اسے بھی جزوِ کتاب بنا لیا گیا ہے۔

"اضافاتِ مزید" کا گوشہ، فورٹ ولیم کالج کے بارے میں دو اہم تحقیقی مقالات پر مبنی ہے جو بیک وقت ہم عصر ماخذ اور جدید ترین مصادر سے استفادہ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں، اس لیے بہت سی نئی اور بنیادی قیمتی معلومات کے حامل اور تلاش و تحقیق کا دل آویز نمونہ ہیں ۔۔ یقین ہے کہ ان کی شمولیت، کتاب کے وزن و وق

اور وجاہت میں اضافے کا باعث خیال کی جائے گی ۔۔ کتاب، وقار عظیم صاحب کے مختصر سوانحی کوائف پر تمام ہوتی ہے۔ اس حصۂ کتاب میں اضافے کی تو بڑی گنجائش تھی، لیکن اسے مزید مختصر کرنا میرے لیے محال تھا، اُمید ہے کہ کتاب پڑھنے والے میری اس مشکل کا احساس کریں گے۔

وقار عظیم صاحب مجھے عزیز رکھتے تھے، قطعِ نظر اس سے کہ میں اس کا مستحق تھا یا نہیں، مَیں دس بارہ برس تک برابر اُن کی رافت و رحمت اور مہر و محبت کا مورد اور مرکز رہا۔ مجھے اُن کے قرب، اُن کی ہم نشینی، اُن کے اعتماد اور ان کی رفاقت کی عزت اور مسرت حاصل رہی:

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مَیں جب پچھلے بیس برس کی مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو بے شمار نقش ہیں جو اُبھرتے ہیں، سامنے آتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فہرست چھوٹی نہیں، خاصی طویل ہے ۔۔ جتنا سوچتا ہوں نام یاد آتے چلے جاتے ہیں اور میرے لیے امتیاز واقعی بڑا مشکل ہے ۔۔۔ اسی طرح رفقا کے معاملے میں، جن رُفقا نے مجھے گویا بھائیوں کی طرح عزیز رکھا اور ہمیشہ مجھے بڑا بھائی سمجھ کر میرے ساتھ سلوک کیا، اُن میں آپ، معین صاحب یہاں موجود ہیں، نہ ہوتے جب بھی آپ کا نام سرِ فہرست ہوتا ۔"

[سید وقار عظیم، گفتگو، ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء]

مَیں نے وقار عظیم صاحب سے بہت کچھ سیکھا ۔۔ اور یہ صرف میرے احساس کی بات نہیں، میری ذات پر اُن کے اثرات بہت ہی نمایاں ہیں جنھیں محسوس کرنے کے لیے کسی خاص بصیرت کی ضرورت نہیں۔

اُس تعلقِ زمانی کی بنا پر جو بہت طویل نہیں، لیکن اس تعلقِ خاطر کے باعث جو بہت گہرا ہے، وقار عظیم صاحب کی ذات اور حیات میرا محبوب و مرغوب مضمون اور موضوع ہے، اُن کی اقدارِ حیات، اُن کی روشِ کار اور اُن کے طریقِ معاملت کو مَیں نے معلوم یا غیر معلوم طور پر اپنایا ہو، اور اسے اپنا معمول اور اپنا وظیفۂ حیات بنایا ہو تو عجب نہیں!

نجے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو پائی ہو، اسے میری نارسائی کہیے، لیکن اُن کی روش حیات اور اُن کی وضعِ احتیاط، میری سمت اور منزل ضرور رہی ہے۔

میرا ایقان ہے کہ وقار عظیم صاحب کی تحریروں کی مہک اور اُن کا حسن اور فیضان دائمی ہے جسے زوال نہیں ــــ اسی لیے وقار عظیم صاحب کی یادگار، یہ کتاب، اُن کی دسویں برسی (۱۷۔ نومبر ۱۹۸۶ء) کی مناسبت سے، بصد اخلاص و احترام، اس قوی اور قلبی احساس کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے کہ یہ اُن کی یاد کو، نئی نسل کے دلوں میں تازہ، روشن اور مستحکم تر کرے گی اور بجائے خود قبولِ عام پائے گی۔

"اُلوقار"
۵۰۔ لوئر مال، لاہور۔۱

۱۴۔ اگست ۱۹۸۶ء

فورٹ ولیم کالج :

پس منظر

فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کا قیام اُردو ادب کی تاریخ کا بہت اہم اور بعض حیثیتوں سے اُردو نثر کی تاریخ کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس کالج کے قیام سے چند ایسے وسائل وجود میں آئے جن سے اُردو زبان کی اشاعت و توسیع کی رفتار میں بھی تیزی آئی اور اس کے نثری ادب کی ترقی کے لیے بھی نئی راہیں کھلیں[1]۔ گو انگریزوں نے یہ کالج بعض انتظامی مصلحتوں اور سہولتوں کی غرض سے قائم کیا تھا لیکن حاکمانہ مصلحت بینی نے بالواسطہ اُردو زبان اور ادب کو بڑا فائدہ پہنچایا اور اس کالج کے زیرِ اہتمام اُردو کی جو تالیفات اور تصنیفات ہوئیں اُنہوں نے اُردو ادب اور خصوصاً اُردو نثر کے مستقبل بہت گہرا اثر ڈالا۔

کالج کے قیام کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۷۹۸ء میں جب لارڈ ولزلی ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہو کر آئے اور اُنہوں نے ملک کے نظم و نسق کا بغور جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ انگلستان سے جو نوجوان کمپنی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے

---

[1] فورٹ ولیم کالج سے پہلے کے نثری ادب کے لیے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی قابلِ قدر کتاب: "اُردو نثر کا آغاز و ارتقا۔ اُنیسویں صدی کے اوائل تک" (مطبوعہ، کریم سنز پبلشرز، کراچی ۱۹۷۸ء) سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ (مُرتّب)

آتے ہیں وہ کسی باقاعدہ اور منظم تربیت کے بغیر اچھے کارکن نہیں بن سکتے۔ لارڈ ولزلی کے نزدیک اس تربیت کے دو پہلو تھے — ایک ان نوعمر اور کم عمر ملازمین کی علمی قابلیت میں اضافہ کرنا اور دوسرے اُنہیں ہندوستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف اور ہندوستانیوں کے مزاج سے پوری طرح آشنا کرنا۔ اس ضروری مقصد کے حصول کے لیے لارڈ ولزلی نے کمپنی کے سامنے ایک کالج قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز کے مطابق وہ اس کالج کو اعلیٰ تعلیم کی ایک ایسی درسگاہ بنانا چاہتے تھے جس میں بعض علمی اور ملکی زبانوں کے علاوہ یورپی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہو اور مختلف علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جائے۔ تعلیم کے اس وسیع اور منظم پروگرام میں عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، لاطینی، یونانی، اُردو، بنگالی اور مرہٹی زبانیں اور علوم و فنون کی فہرست میں تاریخ، جغرافیہ، اصولِ قانون، شرعِ اسلام اور دھرم شاستر جیسی چیزیں شامل تھیں۔ چونکہ اس طرح کے کسی کالج کا قیام اور اس کا انتظام و انصرام زرِ کثیر صرف کیے بغیر ناممکن تھا اس لیے کمپنی نے یہ تجویز اُس شکل میں منظور نہیں کی جو لارڈ ولزلی کے پیشِ نظر تھی۔ البتہ اربابِ کمپنی نے ایک ایسا کالج قائم کرنے کی اجازت دے دی جس میں ملکی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔ لارڈ ولزلی نے اسے بھی غنیمت جانا اور ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو کلکتہ میں تعلیمِ زبان کے اس کالج کی بنیاد رکھی اور اس کا نام فورٹ ولیم کالج رکھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ (GILCHRIST) اس کالج میں ہندوستانی (اُردو) کے پروفیسر مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کو اُردو زبان اور اُس کے مسائل سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ کالج کی ملازمت سے وابستہ ہونے سے پہلے سے اس زبان کی خدمت میں مصروف تھے۔ کالج سے متعلق ہونے کے بعد انہیں اپنی دلچسپی کو عملی صورت دینے اور زبان و ادب کی خدمت انجام دینے کا زیادہ موقع ملا۔

کالج قائم ہونے کے بعد یہاں اُردو کی تدریس و تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ خود بھی اُردو پڑھاتے تھے اور اپنی مدد کے لیے اچھے مدرسوں کا تقرر بھی

کیا تھا۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ کالج کے زیرِ اہتمام اُنہوں نے تصنیف و تالیف کا ایک شعبہ بھی قائم کیا اور اس کام کے لیے مہارت رکھنے والے اہلِ قلم زبان دانوں کی خدمات حاصل کیں۔ کتابوں کے چھاپنے کے لیے اُردو ٹائپ کا ایک مطبع بھی قائم کیا گیا۔ یہ مطبع ہندوستان میں اُردو کا پہلا مطبع تھا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کی سرپرستی اور رہنمائی میں جن ماہرینِ زبان نے ترجمے اور تالیف کا کام کیا ان میں میرامن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لطف، خلیل علی خاں اشک، کاظم علی جوان، نہال چند لاہوری، للو لال جی، بینی نرائن جہاں، مظہر علی ولا زیادہ معروف ہیں اور ان کی تالیفات باغ و بہار، آرائشِ محفل، طوطا کہانی، باغِ اُردو، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، داستانِ امیر حمزہ اور گلشنِ ہند وغیرہ اب بھی بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تصنیف و تالیف کا کام تقریباً بیس برس تک جاری رہا۔ اس بیس برس کی مدت میں متعدد اہلِ قلم اور اہلِ زبان اس سے وابستہ رہے اور انہوں نے ۹۰[۵] کتابیں تصنیف و تالیف کیں لیکن ان کتابوں میں زیادہ معروف اور ادبی حیثیت سے زیادہ اہم وہ ہیں جو کالج کی زندگی کے اُن چار برسوں میں تالیف و ترجمہ ہوئیں جب ڈاکٹر گلکرسٹ اس سے وابستہ تھے۔ ان کتابوں کی ادبی اہمیت اور ادب میں ان کی صحیح قدر و قیمت کا جائزہ لینے سے پہلے خود ڈاکٹر گلکرسٹ اور ان کی تالیفات کا ذکر ضروری ہے۔

---

۵ کالج اور اس کے مصنفین کے بارے میں بحیثیتِ مجموعی مزید مطالعے کے لیے رجوع کیجیے:

(i) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم
نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، صفحات ۲۲۳

(ii) اُردو اسالیبِ نثر تاریخ و تجزیہ (گیارہویں سے بیسویں صدی تک)،
ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین، دہلی ۱۹۷۷ء، صفحہ ۸۶ - ۱۲۴

(iii) ادبی نثر کا ارتقا (شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک)،
ڈاکٹر شہناز انجم، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۰۱ - ۱۹۲

(iv) اُردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند، انجمن ترقی اُردو، کراچی، طبع دوم، ۱۹۶۹ء، صفحات ۸۴۸
(مرتب)

ڈاکٹر گل کرسٹ :

ڈاکٹر گل کرسٹ (جن کا پورا نام جان بارتھوک گل کرسٹ تھا) اسکاٹ لینڈ کے پایۂ تخت ایڈنبرا میں ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اس شہر کے مدرسوں میں حاصل کی اور یہیں کی معروف طبّی درسگاہ "جارج ہارٹ اسپتال" سے اس فن کی تکمیل کی۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے کمپنی کے ملازم ہو کر[1] ۱۷۸۲ء میں بمبئی آئے۔ ایک سال بعد ان کا تبادلہ کلکتہ کا ہو گیا۔

ہندوستان پہنچ کر ڈاکٹر گل کرسٹ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تک میں اس ملک کی وہ زبان نہ سیکھ لوں جسے یہاں کے باشندے بولتے اور سمجھتے ہیں اُس وقت تک نہ اپنے پیشے کی صحیح خدمت انجام دے سکتا ہوں اور نہ لطف و اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ چونکہ وہ اُردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی عام زبان سمجھتے تھے اس لیے بمبئی پہنچنے کے تھوڑے ہی دن بعد یہ زبان سیکھنی شروع کی اور دو تین سال کی قلیل مدّت میں اس میں خاصی استعداد بہم پہنچا لی۔ زبان سے زیادہ واقف ہونے اور اس میں مکمل دستگاہ حاصل کرنے کی غرض سے انہوں نے ۱۷۸۵ء کے شروع میں طویل رخصت لی۔ اپریل ۱۷۸۵ء میں فیض آباد پہنچے اور ہندوستانیوں کی معاشرت اختیار کر کے اُردو زبان کی تحصیل اور تحقیق میں منہمک ہو گئے۔ اس سلسلے میں دہلی، بنارس اور لکھنؤ کا دورہ بھی

---

[1] محمد عتیق صدیقی کا کہنا ہے کہ گلکرسٹ کمپنی کا ملازم ہو کر بمبئی نہیں پہنچا بلکہ وہ ایک قسمت آزما کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور بمبئی پہنچ کر اسے ملازمت ملی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں وہ اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوا، دیکھیے: 'گلکرسٹ اور اس کا عہد' طبع دوم، دہلی ۱۹۷۹ء، ص ۲۹ (مرتب)

کیا اور پنڈتوں اور منشیوں کی مدد سے زبان کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ زبان اور تحقیقِ زبان کے ساتھ اس انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ گل کرسٹ کو مشرقی زبانوں سے عموماً اور اُردو سے خصوصاً بڑی گہری وابستگی پیدا ہو گئی اور انہوں نے کمپنی کے اربابِ اقتدار پر یہ بات واضح کی کہ مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو جانے کے بعد اب فارسی کی پہلی سی حیثیت باقی نہیں رہی اور دفتروں میں اس جگہ اب اُردو کو ملنی چاہیئے ڈاکٹر گل کرسٹ کی یہ کوشش عرصے تک بار آور نہ ہوئی لیکن بالآخر کمپنی کو اُن کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا اور ۱۸۳۲ء میں اُردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کو اُردو سے جو شغف پیدا ہو گیا تھا اس کی بنا پر انہوں نے ایسی قواعدِ زبان اور لغت مرتّب کرنے کی ضرورت محسوس کی جن کی مدد سے انگریزوں کو اردو زبان سیکھنے اور لیاقت پیدا کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ کالج کی ملازمت میں آنے سے پہلے وہ اس طرح کی پانچ کتابیں مرتب کر چکے تھے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ تقریباً چار سال تک کالج سے وابستہ رہے اور صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے ۱۸۰۴ء میں پنشن لے کر واپس چلے گئے۔ گورنر جنرل کی سفارش پر اُن کا تین سو پاؤنڈ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا۔

کچھ مدّت تک اسکاٹ لینڈ میں آرام کرنے کے بعد وہ پھر تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہو گئے بالآخر ۱۸۱۶ء میں لندن آ گئے اور یہاں ایک درسگاہ قائم کر کے ان انگریزوں کو اُردو کی تعلیم دینی شروع کی جو کمپنی کے ملازم ہو کر ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اس میں ڈاکٹر گل کرسٹ کو اردو کا پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۸۲۵ء میں یہ ادارہ بند کر دیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنے طور پر کمپنی کے امیدواروں کو اردو سکھانے کا کام جاری رکھا۔ اُن کی اس دلچسپی، کوشش اور انہماک کا یہ نتیجہ نکلا کہ انگلستان میں اُردو زبان جاننے والوں اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کی اچھی خاصی تعداد پیدا ہو گئی۔

آخر عمر میں ڈاکٹر گل کرسٹ بڑھاپے کی وجہ سے اپنا کام جاری نہ رکھ سکے اور اسے سینڈ فورڈ[1] آرناٹ اور ڈنکن فاربس[2] کے سپرد کرکے اپنے وطن چلے گئے۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر علاج کی غرض سے فرانس گئے اور وہیں شہر پیرس میں ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو انتقال کیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ سنہ ۱۸۰۰ء میں کالج میں اُردو (ہندوستانی) کے پروفیسر مقرر ہوئے اور کالج کے دورانِ قیام میں بعض اہم کتابیں تالیف و مرتب کیں، لیکن خدمتِ زبان کے معاملے میں ان کی سب تالیفات کا سلسلہ کالج سے وابستہ ہونے سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس جگہ ہم ان کی سب تالیفات کا تعارف کراتے ہیں:

(۱) انگریزی ہندوستانی ڈکشنری - مطبوعہ سنہ ۱۷۹۰ء

ڈاکٹر گل کرسٹ کی یہ ڈکشنری اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور مرتب کی کئی سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی کا نتیجہ ہے۔ اُنہوں نے یہ لغت انگریزی لغات کو پیش نظر رکھ کر انہیں اصول کے مطابق مرتب و مدوّن کیا ہے جو مغربی لغت نویس مستند اور مبسوط لغات کے مرتب کرنے میں استعمال کرتے رہے تھے۔ کتاب کی تدوین و ترتیب میں ہندوستان کے اصحابِ علم اور ماہرینِ زبان سے بھی مدد لی گئی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک طویل دیباچہ شامل ہے جس میں کتاب کی ترتیب، تدوین

---

[1] سینڈ فورڈ آرناٹ (SANDFORD ARNOT) دو کتابوں کا مصنف ہے:

(۱) "جدید خود آموز قواعد زبان ہندوستانی" مطبوعہ لندن (۱۸۳۱ء) رومن اور فارسی رسم الخط میں ہے اس کے ضمیمے میں لغات اور زباں دانی کے سبق بھی شامل ہیں۔

(ب) قواعد فارسی - عربی اور دیوناگری حروف میں (مع حواشی از ڈنکن فاربس) مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۴۴ء

[2] ڈنکن فاربس کی "ہندوستانی لغت" (مطبوعہ لندن ۱۸۴۸ء) ابتدائی لغات میں خاصی معروف کتاب ہے۔

[3] ڈاکٹر جان گل کرسٹ کے حالات اور ان کی تصانیف کی تفصیل کے لیے قاری کی توجہ مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے:

(۱) لنگوسٹک سروے آف انڈیا، جلد نہم، مرتبہ سر جارج اے گریرسن

(ب) اربابِ نثرِ اُردو، سید محمد (ج) داستانِ تاریخ اُردو، حامد حسن قادری

طباعت اور اشاعت کے مختلف مراحل کی دشواریوں اور پیچیدگیوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

گل کرسٹ کی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن صحت و اصلاح کے بعد سنہ ۱۸۱۰ء میں ایڈنبرگ (انگلستان) سے شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں الفاظ کے معانی رومن حروف میں درج کیے گئے ہیں اور اس طرح کے اشاروں کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے پڑھنے والوں کو الفاظ کے تلفظ میں زیادہ سے زیادہ سہولت ہو۔[1]

(۲) ہندوستانی گرامر — اُردو کی صرف و نحو پر ایک مفید کتاب ہے۔ پہلی مرتبہ سنہ ۱۷۹۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل تھی اس لیے اس کے کئی ایڈیشن جلدی جلدی شائع ہوئے۔ میر بہادر علی حسینی نے اس کا ایک خلاصہ بھی مرتب کیا تھا جو سنہ ۱۸۰۲ء میں "اُردو رسالہ گل کرسٹ" کے نام سے کلکتہ سے شائع ہوا اور اصل تالیف سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس رسالے کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں مفردات سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے میں مرکبات سے۔ مفردات کے تحت علم صرف کے تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ مرکبات میں مرکب تام اور مرکب ناقص کی سب قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مسائل کی وضاحت کے لیے جا بجا اساتذہ کے اشعار دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں فارسی قواعد کی پابندی کی گئی ہے۔

(۳) مشرقی زباندان (ORIENTAL LINGUIST) مطبوعہ سنہ ۱۷۹۸ء کلکتہ۔

یہ کتاب ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان (اُردو) کا آسان مقدمہ و تعارف ہے۔ اس کے ساتھ انگریزی سے اُردو اور اُردو سے انگریزی الفاظ کا ایک

---

[1] "ڈاکٹر گلکرسٹ نے اس کتاب میں کہیں ہندوستانیوں کو وحشی اور سفاک ظاہر کیا ہے کہیں اُن کی ابلہ فریبیوں کا پردہ چاک کیا ہے اور کہیں اُردو پر مہمل اعتراض کرکے اسے تضحیک کا نشانہ بنایا ہے" — ان خیالات کا اظہار ضمیر نیازی صاحب کے بقول غلام عباس نے اپنے ایک مضمون "ڈاکٹر گلکرسٹ کی عجیب لغت نگاری" میں کیا ہے۔ دیکھیے: سہ ماہی اُردو نامہ، کراچی، شمارہ ۴، اپریل جون ۱۹۶۱ء ص ۳۹-۴۳ (مرتب)

مبسوط فرہنگ شامل ہے۔ شروع میں زبان کے ابتدائی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

(۴) مشرقی زباں داں کا خلاصہ۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۰ء۔

(۵) فارسی افعال کا نظریۂ جدید۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۱ء، دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۴ء۔

اس کتاب میں افعال کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے اور انگریزی اور اردو میں مختلف افعال کے مرادفات بھی دیے گئے ہیں۔

(۶) "رہنمائے اُردو"۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۲ء۔ دوسرا ایڈیشن لندن ۱۸۰۸ء تیسرا ایڈیشن بعد اصلاح و اضافہ ۱۸۲۰ء۔ یہ کتاب اس لیے مرتب کی گئی تھی کہ اس کی مدد سے انگریز آسانی سے اور کم سے کم وقت میں اُردو سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

(۷) مشرقی قصے THE ORIENTAL FABULIST مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

اس کتاب میں اُن حکایتوں اور کہانیوں کا ترجمہ شامل ہے جو حکایاتِ لقمان اور انگریزی، فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت کے واسطے سے مترجم تک پہنچی ہیں۔ اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں گل کرسٹ نے کالج کے دوسرے اہلِ قلم شرکا سے بھی مدد لی تھی۔

(۸) بیاضِ ہندی ۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مؤلفین کے کلامِ نثر کا انتخاب۔

(۹) اتالیقِ ہندی : مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء

گل کرسٹ نے کالج کے اہلِ قلم شرکا سے ایسے مضامین لکھوائے کہ جن کے مطالعے سے اُردو میں نوشت و خواند کی استعداد آسانی سے پیدا ہو سکے اس مجموعے میں شامل کیے ہیں۔ مجموعے میں فارسی کے بعض آسان مضامین کے ترجمے بھی شامل کیے گئے ہیں اور شروع میں فارسی کے صرف و نحو اور اس کے ابتدائی مسائل پر بحث بھی کی گئی ہے۔

(۱۰) علی خاکے : مطبوعہ ۱۸۰۲ء

اس رسالے میں اردو الفاظ کے تلفظ اور ان کو صحیح قرأت کے ساتھ ادا کرنے کے اصول اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۱) ہندی الفاظ کی قرأت : مطبوعہ ۱۸۰۲ء

اس رسالے میں ہندی لفظوں کے تلفظ اور قرأت کے اصول سے مبسوط اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ رسالہ "علی خاکے" کی ترمیم شدہ شکل ہے۔

(۱۲) ہندی عربی آئینہ : مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۲ء

اس رسالے میں عربی لفظوں کے ایسے نقشے شامل ہیں جو اردو زبان سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

(۱۳) ہندی داستان گو: مطبوعہ ۱۸۰۶ء

اس رسالے میں عربی اور دیوناگری رسم الخط پر بحث کی گئی ہے اور اُردو میں ان کے استعمال کے امکانات پر غور کیا گیا ہے۔

(۱۴) انگریزی ہندوستانی بول چال : مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

یہ رسالہ اس غرض سے مرتب کیا گیا ہے کہ انگریز اس کی مدد سے اُردو کی بول چال سیکھ سکیں اور انہیں اپنی روزمرہ کی ضروریات اور معاملات کے سلسلے میں ہندوستانیوں سے گفتگو کرنے میں آسانی ہو۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے ان متفرق کارناموں[۱] پر مجموعی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو

---

[۱] گل کرسٹ کے حالات اور تصنیفی کارناموں کی مزید تفصیل کے لیے رجوع کیجیے:

(i) گلکرسٹ اینڈ دی لینگویج آف ہندوستان (انگریزی)، صدیق الرحمٰن قدوائی، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء۔

(ii) یومز آف ڈاکٹر جان گلکرسٹ (انگریزی)، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور، ۱۹۷۷ء

(iii) گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، طبع اول، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء، طبع دوم، دہلی، ۱۹۷۹ء

(iv) قاعدہ ہندی ریختہ عرف رسالہ گلکرسٹ، مرتبہ: ڈاکٹر محمد انصار اللہ، ادارۂ المخدوم نندپور ضلع کڑپہ، آندھرا پردیش، ۱۹۰۳ء

(v) قواعدِ زبانِ اُردو (رسالہ گلکرسٹ)، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۲ء

(vi) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

صفحات: ۷۸ - ۹۸، ۴۱۹ - ۴۲۱، ۴۲۵، ۴۹۹ - ۵۰۱، ۶۰۷ - ۶۱۲، ۶۱۸ - ۶۱۹ (مرتب)

اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی توجہ زبان اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کی طرف تھی۔ انہوں نے بڑے شوق اور انہماک سے اُردو زبان سیکھی اور اس کی قواعد وانشا کی پیچیدگیوں اور نزاکتوں کا مطالعہ ایک سچے طالب علم کی طرح کیا۔ عرصے تک اُسی معاشرتی ماحول میں رہے جس میں بامحاورہ اُردو بولی جاتی تھی۔ اس ماحول میں رہ کر اُس زبان کے روزمرہ سے واقفیت حاصل کی اور اس کے مزاج میں دخل پیدا کیا۔ زبان سیکھنے کے مختلف مرحلوں اور منزلوں پر علم والوں کے علم اور زبان دانوں کی مہارت و واقفیت سے پوری طرح استفادہ کیا اور جس زبان سے اُنہیں خود دلچسپی اور محبت پیدا ہوگئی تھی اُسے ایک خاص طبقے میں روشناس کرانے کا بیڑا اُٹھایا۔

علمی اعتبار سے کسی زبان کو کسی ایسی جماعت سے روشناس کرانے کے لیے جو اب تک اُس سے واقف نہ ہو، بنیادی طور پر تین طرح کی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس زبان کی ایسی قواعد کی جو قدم قدم پہ زبان سیکھنے والوں کی رہنمائی کر سکے اور اپنی بات کہنے اور دوسرے کی بات سمجھنے میں اُنہیں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اُنہیں مدلل اور منطقی انداز میں دُور کر سکے۔ زبان ایک فرد اور دوسرے فرد یا متعدد افراد کے درمیان خیال کے اظہار و ابلاغ کا بہترین وسیلہ ہے اس وسیلے کو صحت کے ساتھ برتنے اور اسے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مؤثر بنانے کے لیے زبان کے اصول اور قواعد کا علم ضروری ہے۔ اس لحاظ سے کسی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کا پہلا زینہ ان اصول و قواعد کی واقفیت ہے۔

اس واقفیت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کے لیے اور اس واقفیت کی بنیادوں کو استوار اور مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے پاس خیالات کے اظہار و ابلاغ کے لیے الفاظ کا ایسا سرمایہ موجود ہو جس کے استعمال پر اُسے قدرت حاصل ہو۔ الفاظ کے استعمال پر اس کی قدرت اور اُن کی صحت کے معاملے میں اپنے اوپر اعتماد یہ زبان دانی کی دوسری اہم منزل ہے اس اہم منزل کو طے کرنے میں آدمی کو اچھے لغات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس لیے کسی زبان کی بنیادوں کو

[illegible]

[وقار عظیم صاحب کے قلمی مسودے کے ورق نمبر 9 کا عکس]

استوار کرنے کے لیے قواعدِ زبان کی ترتیب کے علاوہ اچھے لغات کی تدوین بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اچھے لغات زبان سیکھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے الفاظ کے تلفظ اور اُن کے مفہوم سے واقفیت حاصل کرنے کے ایسے خزانے ہیں جن تک ہر ایک کی رسائی ہونی چاہیئے۔

منطق اور دلیل کی بنیادوں پر دلچسپ اور عام فہم انداز میں مرتب کیے ہوئے "اصول و قواعدِ زبان"، کاوش اور دقتِ نظر سے مدوّن کیے ہوئے لغات زبان و ادب کی بارگاہ تک پہنچنے کی کنجیاں ہیں۔ لیکن جب کسی کو یہ کنجیاں مل جائیں اور ان کی مدد سے اس کی رسائی زبان و ادب کی بارگاہ تک ہو جائے تو اُسے پھر کسی نہ کسی رہنما کی ضرورت ہے۔ بارگاہِ ادب میں مختلف اصناف سے تعلق رکھنے والی تخلیقات کا جو سرمایہ جمع ہے۔ اس میں اچھی اور بُری، آسان اور مشکل، دلچسپ اور غیر دلچسپ، مفید اور مضر ہر طرح کی چیزیں جمع ہیں۔ ان ادبی اور علمی تخلیقات میں سے اکثر ایسی ہیں جو اس کی استعداد اور اس لیے اُس کے فہم و ادراک سے بالاتر ہیں یا اُس کے مذاق اور پسند سے مطابقت نہیں رکھتیں اس لیے اس رہنما کا کام یہ ہے کہ وہ بارگاہِ ادب کے نووارد کو صرف اُن چیزوں سے متعارف کرائے جو اس کے لیے قابلِ فہم بھی ہوں اور مختلف حیثیتوں سے اس کے لیے دلچسپی کا ذریعہ بھی بن سکیں۔ اگر رہنما کی دوراندیشی حسنِ انتخاب کی یہ خدمت انجام نہ دے سکے تو اندیشہ ہے کہ ادب کا یہ مسافر بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے اور اُسے اس نئی زبان اور اس کے ادب کے ساتھ کسی طرح کی وابستگی نہ پیدا ہو سکے اور اسی لیے دوراندیشی کا تقاضا ہے کہ کسی خاص جماعت کو کسی زبان کی طرف متوجہ اور ملتفت کرنے اور اس کے دل میں اس کے حصول کا شوق پیدا کرنے اور اس شوق کو آہستہ آہستہ ترقی دینے کے لیے اس کے سامنے اس زبان کی قواعد، اس کے لغات اور اس کے ادب کا ایسا ذخیرہ فراہم و مہیا کیا جائے جو زبان سیکھنے، اُسے برتنے اور اس سے وابستگی پیدا کرنے میں پوری طرح مدد دے سکے۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کے متفرق و متعدد کارنامے ایک خاص جماعت میں اُردو کی توسیع و اشاعت کی منطقی کڑیاں ہیں۔ انہوں نے زبان کے اصول و قواعد اور علم اللسان

کے مختلف رسالے ترتیب دیتے وقت اور لغات مرتب و مدوّن کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رکھی ہے کہ یہ کتابیں ان انگریزوں یا یورپین انگریزی دانوں کی سہولت اور مدد کے لیے ترتیب دی جا رہی ہیں جن کے لیے اُردو بالکل نئی زبان ہے۔ اُنہیں ذاتی تجربے کی بنا پر اس بات کا اندازہ ہے کہ کسی انگریز کو صحیح اور بامحاورہ اُردو سیکھنے میں کن کن دقتوں اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور زبان کی قواعد سے واقف ہونے کے بعد کس طرح کی لغت اور اُس کی کیسی ترتیب و تدوین اُس کے لیے مفید اور نتیجہ خیز ہوگی، اور پھر سب سے آخر میں یہ کہ کس طرح کی عبارت اور کس طرح کے مضامین و موضوعات اُس کی دلچسپی، مزاج اور ذہنی سطح سے مطابقت اور ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

قواعد و لغات کی ترتیب و تدوین کا کام ڈاکٹر گلکرسٹ نے خود کیا۔ اس اہم کام میں انہوں نے ملک کے اہلِ زبان اور کالج کے رفقا سے بھی مدد لی، لیکن کام کا بنیادی تصور اُن کا اپنا تھا اور اس سے بھی زیادہ ترتیب و تدوین کے سلسلے میں مشقت اور جاں فشانی بھی خود اُنھوں نے ہی کی۔ تیسرے کام، یعنی پڑھنے والوں کے لیے پڑھنے کا مناسب ذخیرہ فراہم و مرتب کرنے میں اُنھوں نے اُن ماہرینِ زبان اور قادر الکلام نثاروں سے پوری مدد لی جو اس کام کے اُن سے زیادہ اہل تھے گو اس میں شبہ نہیں کہ کام کے اُس پہلو میں بھی اُن کی رہنمائی، حسنِ انتخاب اور سلامتِ ذوق کو بڑا دخل تھا۔

فورٹ ولیم کالج میں شعبۂ تصنیف و تالیف کا قیام اُردو زبان اور نثر کے سفر کی ایک بڑی اہم منزل ہے۔ زبان و ادب کے ارتقا کا جائزہ لینے والا اس منزل پر پہنچ کر اچھی طرح محسوس کر لیتا ہے کہ اُردو نثر کے ارتقا کے نقطۂ نظر سے یہ منزل پچھلی سب منزلوں سے اہم ہے۔ اُردو کے متعدد نثاروں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی سرپرستی اور رہنمائی میں ایک قلیل مدت میں جو کتابیں تالیف کیں اُنھوں نے اُردو نثر کا رُخ بدل دیا۔ اور پہلی مرتبہ اس کے وہ امکانات واضح ہوئے جن کی طرف اب تک کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ نثر نگاری کے اس نئے دور کے آغاز کا سہرا ڈاکٹر گلکرسٹ کے سر ہے۔ انہوں نے اُردو نثر کے ایک قصر کی بنیاد رکھی۔ اس بنیاد میں اُن کی مفید تالیفات سے

استواری و استقامت پیدا ہوئی اور اس مضبوط بنیاد پر فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے ایک عالیشان قصر تعمیر کیا۔ فورٹ ولیم کالج کے ان مصنفین کے کارناموں کا جائزہ اردو نثر کے سب سے اہم دور کا جائزہ ہے۔[1]

---

[1] فورٹ ولیم کالج سے وابستہ بعض اہم یا فورٹ ولیم کالج کے لیے آزادانہ لکھنے والے کچھ قابلِ ذکر مصنفین کے کارناموں کا جائزہ اگلے صفحات کا موضوع ہے۔ اس جائزے میں جن مصنفین کی خدمات کا تذکرہ آیا ہے اُن کے اسما، ترتیب وار یہ ہیں:

میر امّن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مرزا علی لُطف، مولوی امانت اللہ شیدا، مظہر علی خاں ولا، مرزا کاظم علی جوان، شیخ حفیظ الدین احمد، خلیل اللہ خاں اشک، للّو لال کوی، نہال چند لاہوری، بینی نرائن جہاں، مرزا جان طپش، میر عبداللہ مسکین، مرزا محمد فطرت، میر معین الدین فیض اور سید حمید الدین بہاری ـــ

(مرتب)

میر امّن دہلوی:

میر امن دہلوی، جن کا نام میر امان اور تخلص لُطف[1] ہے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سب سے زیادہ معروف ہیں، اُن کے حالات معاصرین یا متاخّرین کے کسی تذکرے میں نہیں ملتے اس لیے اُن کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں۔ اُن کے متعلق زیادہ سے زیادہ حالات وہ ہیں جو انھوں نے خود اپنی مشہور تصنیف "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھے ہیں۔[2] یہ حالات میر امّن نے بڑے لطف و سادگی سے بیان کیے ہیں۔ اس لیے انھیں اپنے لفظوں میں بیان کرنے کے بجائے خود اُنھیں کے الفاظ میں دہرانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

"اپنا احوال یہ عاصی گنہگار میر امّن دلّی والا بیان کرتا ہے کہ میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جاں فشانی بجالاتے رہے، اور وے بھی پرورش کی نظر سے قدردانی

---

[1] صاحبِ "ارباب نثرِ اُردو" نے اپنی تالیف کے صفحہ ۱۴ پر "سیر المصنفین" کے مؤلف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے میر امن کا تخلص لطف بتایا ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔ حقیقت میں اُن کی اس اطلاع کا ماخذ "طبقاتُ الشعرائے ہند" ہے جس میں ان کا تخلص امان اور لطف بتایا گیا ہے۔

[2] میر امن کے کچھ حالات، اُن کی تالیف "گنج خوبی" کے دیباچے میں بھی ملتے ہیں۔

جتنی چاہیئے فرماتے رہے، جاگیر و منصب و خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر مالامال اور نہال کر دیا اور "خانہ زادِ موروثی و منصب دارِ قدیمی" زبانِ مبارک سے فرمایا۔ چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اسی کے سبب سے آباد تھے) یہ نوبت پہونچی کہ ظاہر ہے، عیاں راچہ بیاں، تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا اور احمد شاہ دُرّانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلاوطن ہوا[1] اور ایسا جہاز (کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا) غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے، کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی، آخر وہاں سے بھی پاؤں اُکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی، عیال و اطفال کو چھوڑ کر تنِ تنہا کشتی پر سوار ہوا۔ اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہونچا۔ چندے بیکاری میں گزری۔ اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا۔ لیکن نباہ اپنا نہ دیکھا، تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی۔ بارے طالع کی مدد سے ایسے جواں مرد کا دامن ہاتھ لگا ہے، چاہیئے کہ کچھ دن بھلے آویں، نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں اور گھر میں

[1] میر امن کی اس خانہ ویرانی اور جلاوطنی کا دَور وہی ہے جس میں سے ہم میرؔ و سوداؔ کو گزرتے دیکھ چکے ہیں۔ ان دنوں غریب الوطن شاعروں، فنکاروں اور امیرزادوں کا ملجا و ماویٰ فیض آباد اور عظیم آباد کے نوابوں کے دربار بھی تھے۔

دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دُعا اس قدردان کو کرتے ہیں۔ خدا قبول کرے"۔

میر امن نے اس مختصر سی عبارت میں اپنی زندگی کا خلاصہ جس حُسن و خوبی سے بیان کیا ہے وہ ان کی قدرتِ بیان اور حسنِ توازن کا ثبوت ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے انتشار اور مغل بادشاہوں کی بے کسی و بے بسی کی وہ ساری تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے جو مورّخوں نے زیادہ تفصیلات و جزئیات کے ساتھ کھینچی ہے۔ اس سیاسی انتشار نے معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر جو گہرا اثر ڈالا تھا اور اس افراتفری میں دلّی والے جس طرح دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے اس کا دردانگیز نقشہ بھی میر امن کی اس آپ بیتی میں موجود ہے۔ دلّی سے چل کر میر امن کہاں کہاں گئے اور کیا کیا کرنے پر مجبور ہوئے اس کا ذکر بھی گو تفصیل سے نہیں ہوا لیکن اس اجمالی تذکرے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ دلّی سے روانگی اور جان گلکرسٹ تک رسائی ہونے کے درمیان اُن کا وقت سکون و اطمینان سے نہیں بلکہ سخت بے چینی سے کٹا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ تک رسائی ہوئی تو اُنھوں نے میر امن سے قصہ چہار درویش کو اُردو میں لکھنے کی فرمائش کی اور اس میں عام بول چال کی زبان استعمال کرنے کی تاکید کی اس محل پر بھی میر امن نے 'باغ و بہار' کے دیباچے میں جو الفاظ لکھے ہیں وہ اس لیے اہم ہیں کہ ان سے گلکرسٹ کے اُس نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے جو اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کے سلسلے میں اختیار و رائج کیا تھا۔ میر امن نے لکھا ہے کہ:

"جان گلکرسٹ صاحب نے لطف سے فرمایا کہ اس قصّے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کا مقصد یہ تھا کہ اُن کے ذریعے کمپنی کے نو آموز ملازمین کے پڑھنے کے لیے موزوں مواد فراہم کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ گلکرسٹ

نے میر امن کو وہ زبان اختیار کرنے کی تاکید کی ہے جو خاص و عام کی روزمرہ کے مطابق ہو۔

میر امن نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر فارسی کے "قصہ چہار درویش" اور ملا حسین الواعظ کاشفی کی کتاب "اخلاقِ محسنی" کو اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ پہلی کتاب کا تاریخی نام "باغ و بہار" ہے اور دوسری کتاب کا نام اُس کے اخلاقی مضامین کی بنا پر "گنجِ خوبی" رکھا گیا۔ لیکن ان دو کتابوں میں سے پہلی کتاب کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ اردو کی بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہے۔ میر امن کی "باغ و بہار" کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یورپ کی کئی زبانوں انگریزی، فرانسیسی، پرتگالی اور لاطینی میں اس کے ترجمے کیے گئے اور ترجمے کے بعد اُن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اُردو میں تو اس کی اشاعت کا شمار نہیں۔ ہندوستان کے اکثر معروف چھاپے خانوں نے اس کے کئی کئی ایڈیشن شائع کئے اور چھوٹے بڑے مختلف مطابع نے اسے ہزاروں کی تعداد میں چھاپا۔ اُن عام نسخوں کے علاوہ جو بازار میں عام طور پر ملتے ہیں محققین نے بھی اس کتاب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس کی صحت کر کے اسے علمی انداز میں مرتب کر کے اہتمام کے ساتھ چھپوایا ہے۔ ان میں سے اکثر ایڈیشن گو بازار میں دستیاب نہیں ہیں لیکن پاکستان اور بھارت کے اکثر اچھے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

باغ و بہار کے جو ایڈیشن اہتمام کے ساتھ چھپے اور جن کی صحت کی طرف پوری توجہ دی گئی ان کی تعداد بھی خاصی ہے۔ اس کا سب سے پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں فورٹ ولیم کالج کے چھاپے خانے سے ٹائپ میں چھپا اور اسی ایڈیشن کے مطابق کئی ایڈیشن کلکتے سے شائع ہوئے اور بعد میں لندن سے۔ ۱۸۲۲ء کا مدراس سے شائع ہونے والا نسخہ، ۱۸۳۲ء کا کانپور کا نسخہ، ۱۸۴۳ء کا وہ نسخہ جو مولوی محمد باقر کے چھاپے خانے سے چھپا، ۱۸۴۴ء میں لکھنؤ سے شائع ہونے والا نسخہ اور ۱۸۴۷ء میں دہلی مدرسہ کی طرف سے چھپنے والا نسخہ حسن اہتمام اور صحتِ متن کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ لیکن ان سب نسخوں میں اہم تر وہ ایڈیشن ہے جو نامور مستشرق ڈنکن فاربس (DUNCAN FORBES) نے مرتب کیا ہے۔ اس نسخے کی ترتیب و تدوین میں فاربس نے

۱۸۰۳ء والے کلکتہ کے ایڈیشن کو بنیاد بنا کر دو قلمی نسخوں سے مدد لی ہے۔ ان قلمی نسخوں میں سے ایک نسخہ وہ ہے جو میر امن نے ڈاکٹر گلکرسٹ کو پیش کیا تھا۔ دوسرا نسخہ میر امن کے شاگرد مسٹر رومر کا تھا۔ اس نسخے کا کچھ حصہ میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کچھ میر امن کی نگرانی میں لکھا گیا ہے۔ اس نسخے کے ساتھ ایک بے حد کار آمد اور خاصی طویل لُغت بھی شامل ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۵۱ء میں رومن رسم الخط میں لندن میں شائع ہوا اور اس کے کئی اور ایڈیشن بھی چھپے۔ چوتھے ایڈیشن میں فاربس نے بنگال کے ڈائرکٹر تعلیمات W. N. LEES کی خواہش پر کتاب کے ایسے حصے نکال دیئے جو طالب علم کے نقطۂ نظر سے کسی قدر مُبتذل کہے جا سکتے تھے۔ یہ ایڈیشن ۱۸۷۳ء میں چھپا۔

"باغ و بہار" کا ایک اچھا نسخہ مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو نے بھی شائع کیا تھا۔ اس مقدمے میں مولوی صاحب نے "باغ و بہار" کے ادبی اور لسانی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اس کے ماخذ کے متعلق بھی بحث کی ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ میر امن کی کتاب فارسی کی چہار درویش کا ترجمہ نہیں بلکہ تحسین کی "نوطرزِ مرصع" سے ماخوذ ہے۔ مولوی صاحب نے اس ساری بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میر امن نے تحسین سے استفادہ کرنے کے باوجود اس کا اعتراف نہ کر کے ایک طرح کی ادبی بددیانتی کا ارتکاب کیا ہے۔ مولوی صاحب کے اس الزام کا جواب محمود شیرانی نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ کلکتہ سے "باغ و بہار" کا جو ایڈیشن شائع ہوا تھا اُس کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

باغ و بہار

تالیف کیا ہوا میر امن دلی والے کا

ماخذ اس کا نوطرزِ مرصع کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین کا ہے فارسی قصہ

چہار درویش سے۔

اس عبارت کی موجودگی میں میر امن پر مولوی صاحب موصوف کا اعتراض قائم نہیں رہتا۔ یہ عبارت میں نے اس ایڈیشن کے سرورق پر بھی دیکھی ہے جو ۱۸۶۰ء میں

ولیم وائس کے مطبع واقع لندن سے شائع ہوا تھا۔

باغ وبہار کے دیباچے میں میرامّن نے قصہ چہار درویش کی ابتدا، کے متعلق یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت نظام الدین اولیا بیمار پڑے تو اُن کے مریدِ خاص حضرت امیر خسرو نے اُن کا جی بہلانے کے لیے یہ قصّہ اُنھیں سُنایا۔ حضرت نظام الدین اولیا کو اللہ نے صحت فرمائی تو اُنھوں نے یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سُنے گا تندرست رہے گا۔ جب سے یہ قصّہ فارسی میں مروّج ہوا۔ میرامّن کی اس روایت کو تحقیق کی کسوٹی پر کسا گیا تو اس لیے غلط ثابت ہوئی کہ امیر خسرو کی تصانیف کے سلسلے میں اس کا ذکر مورخوں نے کہیں نہیں کیا۔ دوسرے اس قصّے کے جتنے فارسی متن موجود بتائے جاتے ہیں اُن میں سے کسی کو اسلوب کے اعتبار سے امیر خسرو کا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ قصّہ کس زمانے میں لکھا گیا اور فارسی میں مختلف لکھنے والوں نے اسے کس کس طرح اپنے اپنے مخصوص اسالیب کے سانچے میں ڈھالا اس کی بڑی اچھی بحث محمود شیرانی نے اپنے مضمون "باغ وبہار" میں کی ہے جو اُن کے مجموعۂ مضامین "مقالاتِ شیرانی" میں شامل ہے۔

میرامّن نے اپنے دیباچے میں اس بات کی طرف بھی واضح اشارہ کیا ہے کہ یہ کتابیں کس غرض سے لکھوائی گئی تھیں۔ میرامّن کے ان الفاظ کا اعادہ شاید بے محل نہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں :

"صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اُردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت وشنید کریں اور ملکی کام کو باآگاہی تمام انجام دیں اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال میں بموجب فرمائش کے تالیف ہوئیں"۔

قصہ چہار درویش کو میرامّن کے علاوہ دو اور مُصنّفوں نے بھی اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ ایک عطا حسین خاں تحسین جنھوں نے اس قصے کو اُردو میں لکھ کر اس کا نام نوطرزِ مرصّع رکھا ہے۔ (اس کتاب کی داغ بیل ۱۷۶۸ء میں پڑی تکمیل ۱۷۷۵ء

میں ہوئی[1]) دوسری محمد عوض زرین کی کتاب "باغ وبہار" ہے۔ اس کا سنہ تالیف وہی ہے جو میرامّن والی "باغ وبہار" کا۔ لیکن تحسین اور زریں کی کتابوں کو اُس شہرت و مقبولیت کا عشر عشیر بھی میسّر نہیں آیا جو میرامّن کی باغ وبہار کا حصّہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ تحسین اور زرّیں کی عبارت میں میرامّن کی تحریر جیسی دلکشی نہیں۔ تحسین کی عبارتیں عموماً حد درجہ پُرتکلف اور پیچیدہ ہیں اور پڑھنے والے کے لیے تکدّر کا باعث بنتی ہیں۔ زرّیں کی تحریر میں سادگی کے ادّعا کے باوجود تکلّف ہے۔ تحسین اور زرّیں دونوں کے یہاں آورد کی بھرمار ہے، اور دونوں کی عبارتیں خشک اور بے مزہ ہیں۔ شگفتگی اُن میں نام کو نہیں۔ اس کے برخلاف میرامّن کی عبارت کا ہر فقرہ ایک خاص طرح کے ادبی لطف کا حامل ہے۔ اس کی روزمرہ میں انتہائی سادگی کے باوجود ہر جگہ انشا پردازی کی شان ہے۔ وہ قواعد کی صحت سے زیادہ روزمرّہ کی لذّت اور محاورے کی حلاوت وچاشنی کو اہمیت دیتے ہیں اس لیے کہ اُن کے نزدیک زبان کے روزمرّہ کی سادگی اور گھلاوٹ اور محاورے کی بےتکلّفی وبرجستگی میں ایک مخصوص معاشرے کی روایتوں کا عکس بھی ہوتا ہے اور بولنے اور لکھنے والے کی شخصیت کے مخصوص رنگ کی جھلک بھی۔ کسی خاص زبان کا روزمرہ اور اس کا محاورہ، اس کی صدیوں کی تہذیبی روایتوں کی ترشی اور نکھری ہوئی صورت ہے۔ اس ترشی اور نکھری ہوئی صورت کی مصوّری کا پورا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مصوّر (یا یوں کہہ لیجیے کہ مصنف ومُولف) اپنے آپ کو اس معاشرے کی تفصیلات وجُزئیات میں گم کردے اور انھیں اس طرح اپنے آپ میں جذب کرے کہ اُس کی فنّی تخلیق میں (خواہ وہ تصویر ہو یا تحریر) اس کے ارادے اور کوشش کے بغیر ان کا رنگ روپ ابھرا ہوا دکھائی دے۔ اس سلسلے میں میرامّن کے نقطۂ نظر کی صراحت باغ وبہار کے دیباچے کے ان الفاظ سے ہوتی ہے :

---

[1] ڈاکٹر گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، طبع دوم ۱۹۶۹ء، کراچی، صفحہ ۱۴۳ (مرتّب)

"...... سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے ہیں کہیں اور تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے۔ جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کے ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسی سبب سے دلّی میں گئے اور رہے وے بھی کہاں تک بول سکیں گے، کہیں نہ کہیں چوک ہی جاویں گے۔ اور جو شخص دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امُراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عُرس چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی رات تک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کا لحاظ رکھا ہوگا، اُس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے۔"[۱]

میراَمن کے گھرانے کی کئی پشتیں دلّی میں گزری تھیں اور دلّی کا محاورہ اور اُس کی ٹکسالی زبان، تراش خراش اور نکھار سنوار کی جن منزلوں سے گزری تھی اُس کا اثر مستقل ہوتا ہوا میراَمن تک پہنچا تھا۔ پھر خود انہوں نے بھی معاشرے کی مختلف سطحوں میں گھُل مل کر اس کے محاورے پر عبور حاصل کیا تھا اور اس طرح زبان و بیان پر اور دلّی کے

---

[۱] میراَمن نے اس عبارت میں زور محض اس بات پر دیا ہے کہ کسی خاص معاشرے کی زبان، اس کے روزمرّہ اور محاورے پر پُورا عبور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی کئی پشتیں اس معاشرے میں بسر ہوئی ہوں اور اس نے زندگی کے کوچے کو اچھی طرح چھانا ہو۔ اس بات کو آگے آنے والوں نے غرور و تکبّر سے تعبیر کیا چنانچہ رجب علی بیگ سرور نے اپنی معروف تصنیف "فسانۂ عجائب" میں اس بات کو بڑی اہمیت دی اور پھر اس قصّے نے ایک اچھے خاصے ادبی مجادلے کی صورت اختیار کر لی۔ اس مجادلے کا تجزیہ وقار عظیم نے ایک مضمون "باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا قضیہ" میں کیا ہے جو "ہماری داستانیں" شائع کردہ ادارہ فروغ اُردو، لاہور میں شامل ہے۔

روزمرہ اور محاورے پر وہ قدرت حاصل کی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے (یا کم از کم تحسین اور زریں اس سے محروم رہے ہیں) روزمرہ اور محاورے سے اسی مسلسل تعلق اور ربط کا نتیجہ ہے کہ ان کی عبارت میں وہ رس اور گھلاوٹ ہے، جو آورد اور تکلف سے ہرگز پیدا نہیں ہوتی۔ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر دلّی کے معاشرے کی ٹکسال کی مُہر بھی ثبت ہے اور ان کی اپنی شخصیت اور مزاج کا گہرا نقش بھی۔ یہ بات قدیم نثاروں میں میراَمن کے سوا، اور قدیم تصانیف میں 'باغ و بہار' کے سوا اور کسی میں نہیں۔

زبان و بیان پر اور خصوصاً دلّی کے روزمرّہ اور وہاں کی بامحاورہ ٹکسالی بولی کے استعمال پر میراَمن کو جو عبور اور قدرت حاصل ہے، اس سے قطع نظر میراَمن کے اسلوبِ نگارش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قیمت پر عبارت میں ترنّم و آہنگ پیدا کرنا ضروری جانتے ہیں۔ یہ ترنّم و آہنگ پیدا کرنے کے لیے وہ قافیے اور سجع کے عام وسائل سے کام لینے کے بجائے الفاظ کے موزوں انتخاب اور اُن کی صحیح اور متوازن بندش و ترتیب سے مدد لیتے ہیں۔ قواعد کے مُسلّمہ اصول اور قاعدوں سے بلاتکلف گریز کرتے ہیں۔ جہاں جی چاہتا ہے مضاف، مضاف الیہ اور صفت موصوف کی ترتیب بدل لیتے ہیں، حرفِ ربط سے ایک کی جگہ کئی کئی کام لیتے ہیں، واحد سے جمع بنانے کے عام قاعدوں سے انحراف کرتے ہیں اور اس طرح کرتے ہیں کہ عبارت کا مجموعی اثر بے حد لطیف اور خوشگوار ہوتا ہے۔

میراَمن کے پاس اپنے سب ہم عصروں کے مقابلے میں الفاظ کا سرمایہ زیادہ ہے اور وہ اس سرمایے کے صَرف پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود حسبِ ضرورت وہ بے تکلف نئے لفظ گھڑتے اور نئی ترکیبیں وضع کرتے ہیں اور اس عمل میں ہندی کی واقفیت اور فارسی کے علم سے پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چونکہ نئے لفظوں کی تراش اور موزوں ترکیبوں کی ساخت میں ہر جگہ سلیقے اور حسنِ مذاق کو دخل ہے اس لیے اُن کے نئے لفظوں اور خود ساختہ ترکیبوں میں سے اکثر ایسی ہیں کہ ڈیڑھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی ان میں اجنبیت نہیں پیدا ہوئی۔ بعض لفظ اور ترکیبیں البتہ غیر مانوس

ہیں، لیکن اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان لفظوں اور ترکیبوں کو آزادی کے ساتھ استعمال کر کے ہم نے انہیں زبان میں پوری طرح رچنے کا موقع نہیں دیا۔

میر امن اُردو زبان کے مزاج داں اور اس کی نزاکتوں کے رمز شناس ہیں اس لیے بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اُن کی عبارت کا کوئی ٹکڑا پڑھنے والے کے ذہن پر گراں گزرے یا اُس میں انبساط و شگفتگی نہ پیدا کر سکے۔

'باغ و بہار' پر شروع سے آخر تک انبساط و شگفتگی کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اس فضا کو پیدا کرنے میں میر امن کو بلا شبہ سب سے زیادہ مدد اُن کی قدرتِ بیان اور زبان کے استعمال میں ایک خاص طرح کے سلیقے اور حُسنِ ذوق سے ملی ہے لیکن قصّے اور داستان کی حیثیت سے بھی اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جنہوں نے اُسے اُردو کی دوسری داستانوں میں ایک امتیازی جگہ دی ہے۔ [1]

---

[1] باغ و بہار کے ادبی اور فنی محاسن پر اُردو کے مختلف نقادوں نے جو مختلف باتیں لکھی ہیں اُن کے اندازے کے لیے ذیل کے مضامین اور کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) خطباتِ گارساں دتاسی، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن (۱۹۳۵ء)، صفحات ۲۴ تا ۴۴

(۲) آثار الصنادید (سرسید احمد خاں) مطبوعہ سید الاخبار دہلی (۱۸۴۷ء) چوتھا باب

(۳) فنِ داستان گوئی ۔ کلیم الدین احمد۔

(۴) ہماری داستانیں ۔ وقار عظیم ۱۹۵۵ء مضامین متعلقہ 'باغ و بہار' (مولف)

(۵) باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ ، زہرا معین لاہور ۱۹۶۷ء، ۱۹۷۳ء، ۱۹۸۵ء

(۶) باغ و بہار پر ایک نظر ، ڈاکٹر سہیل بخاری ۱۹۶۸ء

(۷) باغ و بہار ۔ ایک تجزیہ ، ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۶۹ء

(۸) اُردو کی نثری داستانیں ۔ ڈاکٹر گیان چند، ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۹ء

(۹) مقدمہ ، باغ و بہار ، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، ممتاز حسین، ممتاز منگلوری، ڈاکٹر سلیم اختر۔

(۱۰) وجہی سے عبدالحق تک ، ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۷۷ء

(۱۱) اردو نثر کا دہلوی دبستان ، ڈاکٹر احمد ابراہیم جاگیردار ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۷۵ء

(۱۲) باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (مجموعۂ مضامین) مرتبہ سلیم اختر، لاہور ۱۹۶۸ء

(۱۳) باغ و بہار کا تنقیدی جائزہ ، امام مرتضیٰ نقوی، لکھنؤ ۱۹۷۸ء

(مرتب)

زبان و بیان کے حُسن اور اسلوبِ نگارش میں روزمرہ اور محاورے کی پابندی کے بعد باغ و بہار کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں ایک خاص زمانے کی معاشرت اور اس خاص معاشرے کی تہذیب کی خصوصیات کا بڑا گہرا رنگ چھایا ہوا ہے۔ میر امن خواہ کسی واقعے کا ذکر کریں خواہ کسی کردار کے حالات بیان کریں، خواہ کرداروں کو کسی تصادم اور کشمکش میں مبتلا دکھائیں ہر جگہ اس تہذیب اور اس معاشرت کا مزاج پوری طرح منعکس نظر آتا ہے۔ واقعات کے نقش میں اور کرداروں کے عمل اور ردّ عمل میں اس تہذیب کے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ داستان گو نے ہر جگہ تخیل اور تصور کو اپنے مشاہدات اور زندگی کے حقائق کا پابند اور تابع رکھا ہے۔ وہ کہانی میں دلچسپی اور تاثیر کے عناصر پیدا کرنے کے لیے بھی دور از کار تصورات اور بعید از قیاس شاعرانہ تخیلات کا سہارا لینے کے بجائے زندگی کی ایسی تفصیلات سے مدد لیتا ہے جن سے وہ اپنے مشاہدے کی پوری واقفیت رکھتا ہے۔ زندگی کی ایسی تفصیلات جو اس معاشرے اور تہذیب کی نسلوں کی روایت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں داستان گو کے تجربے کا کبھی جدا نہ ہونے والا عنصر ہیں۔ وہ کوشش کرے یا نہ کرے اس کی کہی ہوئی ہر بات پر اس روایت کا نقش ثبت ہوتا ہے۔ باغ و بہار میں مشاہدے کی جزئیات اور معاشرتی اور تہذیبی روایات کس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو کر اس کے ایک ایک لفظ کو متاثر کرتی ہیں اس کا اندازہ ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔

پہلا درویش اپنے حالات بیان کرتے کرتے اس جگہ پہنچتا ہے جہاں زمانے نے اُسے اس قابل بھی نہیں رکھا کہ اُسے "دمڑی کی ٹھڈیاں" میسر ہوں اور وہ انہیں چبا کر پانی پئے۔ اس حالت میں اُسے وہ بہن یاد آتی ہے جس کی اُس نے مدتوں سے خبر تک نہ لی تھی، لیکن اب اس گھر کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہ تھا اس لیے گرتا پڑتا کئی منزل کاٹ کر اس کے گھر پہنچا۔ اس کے گھر پہنچ کر جو کچھ پیش آیا اُس کا حال میر امن نے اس طرح بیان کیا ہے:

"وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔

تیل، کالے ماش، نکے مجھ پر سے صدقے کیے۔ کہنے لگی، "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟" اس کا جواب کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا، میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا سوہن، پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ، نان قلیے کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطرداری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی بارگاہ میں ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گزرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی 'اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں' باغ باغ ہوتی ہوں، تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے، گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔ خصوص اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے' اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی' میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب صلاح یہ ہے کہ قصد سفر کا کرو، خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو ...'

'باغ و بہار' کی اس عبارت کو توجہ اور غور سے پڑھ کر اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے تو کئی باتیں نظر کے سامنے آتی ہیں:

سب سے پہلی چیز تو میر امن کی عبارت میں روزمرہ اور محاورے کا وہ رنگ ہے جس کی طرف بار بار اشارہ کیا جا چکا ہے اور جو میر امن کے طرز اور اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ واقعے اور کردار کے نقش کو واضح کرنے اور اُبھارنے کے لیے میر امن نے دلّی کی جو روزمرہ اور ٹکسالی زبان استعمال کی ہے وہ اُس محل اور مقصد سے قطع نظر جو اس کے ساتھ وابستہ ہے بجائے خود پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی اور اس کے لیے کشش کا سبب بنتی ہے۔

دوسری اہم چیز وہی معاشرتی اور تہذیبی رنگ ہے جسے ہم نے میر امن کا دوسرا بڑا امتیاز بتایا ہے۔ ہندوستان کے معاشرے میں خواہ وہ اب سے ڈیڑھ سو پہلے ہی کا معاشرہ کیوں نہ ہو، بہن اور بھائی کا رشتہ محبت اور یگانگت کا ایسا رشتہ سمجھا جاتا ہے جس کی مثال دوسرے معاشروں میں نہیں ملتی۔ بھائی کی ہزار برائیوں کے باوجود بہن کے دل میں اس کی جو جگہ ہوتی ہے اس میں ایک سماوی شان ہے۔ لیکن محبت کی یہ 'الوہیت' ایثار و خدمت گزاری جس کے اہم اور لازمی اجزا ہیں' ہمیشہ معاشرے کے رسوم و قیود اور تہذیبی روایات کی پابندیوں کو نظر میں رکھتی اور انھیں بہرحال محترم بلکہ مقدس جانتی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے لیکن اپنے بھائی کی عزت اور اپنے ماں باپ کا نام اس کی زندگی کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے کہ اُسے کسی طرح بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ 'بہن' بھائی کی خدمت میں اپنے جی جان کا آرام تج سکتی ہے لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ کوئی اُس کے بھائی کی طرف اُنگلیاں اُٹھائے۔ اُسے محبت کا رشتہ بے حد عزیز ہے لیکن اس رشتے کے نباہ میں بھی اس بات کی طرف سے غافل ہونا کہ دنیا اور اس کی رسمیں، معاشرے اور اس کی روایتیں کس چیز کا تقاضا کرتی ہیں' اس کے لیے ناممکن ہے۔ اوپر کی عبارت میں ہمیں ہندوستانی معاشرے کی یہی مثالی "بہن" گفتگو اور عمل میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔

مدّتوں بعد اس کی ملاقات بھائی سے ہوتی ہے تو وہ اس کی بلائیں لیتی ہے اور اُس سے گلے مل کر روتی ہے، اپنے معاشرے کی رسم کے مطابق تیل، کالے ماش اور ٹکے اُس پر سے صدقے کرتی ہے۔ اُس کے لیے اچھے سے اچھے لباس اور اچھی سے اچھی غذا کا اہتمام کرتی ہے اور جب بھائی اچھی طرح آرام کر چکتا ہے تو دنیا والوں کے طعنے مہنے سے ڈر کر اور اپنی اور بھائی کی جگ ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو لاج لگنے کے خوف سے اُسے کچھ کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور باتوں باتوں میں وہ سب کچھ کہہ جاتی ہے جو معاشرے کے مزاج میں رچا بسا ہوا ہے — مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے، جو مرد نکھٹو ہوتے ہیں اُنہیں دنیا والے طعنے دیتے ہیں، جو آدمی بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑتا ہے لوگ اُسے بے غیرت کہتے ہیں، اُس پر ہنستے ہیں اور اس چیز سے ماں باپ کی بھی بے عزّتی ہوتی ہے۔

اور ان سب چیزوں کے ساتھ بہن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کے کردار سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ "اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے، تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا" — "نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔" ان لفظوں کی رگ رگ میں محبت صاف سمائی ہوئی نظر آتی ہے

اس عبارت کی تیسری خصوصیت اس کی وہ تفصیلات و جزئیات ہیں جو داستان گو کے مشاہدے نے فراہم کی ہیں۔ ان تفصیلات میں ہر جگہ حقیقی زندگی کی ایک ایسی لہر ہے جو پوری فضا کو جاندار بناتی ہے۔

اور ایک چوتھی بات جو اس عبارت کو پڑھنے والا ضمنی طور پر محسوس کرتا ہے یہ ہے کہ میر امّن نے ایک خاص معاشرے اور تہذیب کے مزاج کی صحیح عکاسی کر دینے اور حقائق کی ایک واضح اور کامیاب تصویر بنا دینے کے باوجود اپنے آپ کو کہیں غیر ضروری اور بے جا طوالت پسندی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اس نے واقعات کے بیان میں اور کرداروں کی کیفیتوں کے اظہار میں صرف اُتنی تفصیلات سے کام لیا ہے جتنی نقش

کو مکمل کرنے یا ایک مخصوص تصوّر اور تأثّر پیدا کرنے کے لیے ضروری تھیں۔

میر امّن کے طرز کے جن پہلوؤں کی وضاحت اوپر والی مثال کے ذریعے کی گئی اُن کا لطف اس وقت اور بھی نمایاں ہوتا ہے جب پڑھنے والا اس عبارت کو اُن عبارتوں کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے، جو اس محل پر زرّیں نے اپنی باغ و بہار اور تحسین نے نو طرز مرصّع میں استعمال کی ہیں۔

اس موقعے پر زرّیں کی عبارت یہ ہے:

"ہمیشہ صورتِ فقیر دیکھ کر روئی۔ کہا 'اے بھائی! دولت مفت کھوئی۔' پھر غذائے لطیف لائی۔ پوشاک فاخرہ پہنائی۔ کئی مہینے رہا۔ ایک دن ہمشیر نے کہا۔ بھائی بیکاری باعثِ ناقدری ہے، اور دلیلِ بے ہنری ہے۔ سوداگر شام کو جاتے ہیں، تو بھی متاعِ تجارت خرید لا۔ اُن کے ساتھ جا۔ پریشانی دور اور فراغت بدستور ہوگی۔"

اِس واقعے کا ذکر تحسین نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"وہ مشفقہ مہر پرور دل نواز نے بمقتضائے شفقت و عطوفت کے سرور ملاقات میری کے سے مثل گل کے شگفتہ و سرخ رنگ ہوئی و دریافت احوال سراپا ملال میرے کے سے مانند غنچے کے دل تنگ ہوئی اور اس سرگردانِ دشت کو وحیرانی کے تئیں بیچ ایک مکان مطبوع و دلکش کے جائے سکونت کی دے کر ملبوساتِ زیبا و فاخرہ و لوزیات لطیف و بامزہ و اغذیات خوب و خوش کے تئیں لا کے حاضر کیا، جو اس بے سرو سامان کے تئیں عالم تباہی میں بیچ سیر و تماشائے جہاں کے صورت گندم کی سوائے گندمی رنگ چہرۂ خوبوں کے شکل کنجد کی سوائے خالِ رخسارۂ محبوبوں کے ایک مدّت سے نظر نہ پڑی تھی۔ ایک مرتبہ سبب مہیّا ہونے سب اسبابِ جمعیت کے دوگانہ شکر کا بہ درگاہِ حضرت واہب العطایا کے کہ فضل و کرم اس کا مرہم ناسورِ دل دردمندوں کا ہے، ادا کیا..."

اور چند روز قدم اس آرام گاہ سے باہر نہ دیا۔ رفتہ رفتہ ایک روز اُس کان مروّت کی نے نزدیک میرے آ کے بعد از ذکر اذکار اور طرف کے معلوم فرمایا کہ اے نورِ باصرہ بصیرتِ ہمشیرہ کے اگرچہ ہنوز آتشِ غمِ مفارقت کی آبِ زلال سیری مواصلت مواصلت تیری کے سے کما حقّہٗ منطفی نہیں ہوئی اور دیکھنا تیرا ہر دم باعثِ زندگانی اس عاجزہ کا ہے لیکن مردوں کے تئیں خانہ نشین ہونا سبب پریشانی گوناگوں اور علاوہ اس کے مطعونِ خاص و عام کے ہے خصوصاً تیے جہت استقامت اس شہر کے سے خویش و بیگانے منطعنہ اور بہ ناخلفی و بے ہنری و دوں ہمتی تیری کے لے جا کے زبان طعنے کی دراز کریں گے۔ اس صورت میں واسطہ خفت و ندامت میری و تیری کا اور بدنامی و گمنامی مادر و پدر کا ہے۔ پس صلاح دولت یہ ہے کہ ارادہ سفر کا او پردل اپنے کے مُصمم رکھ، انشاء اللہ تعالیٰ اس وسیلۂ جمیلہ سے یقین ہے کہ شب ظلمات صعوبت خانہ خرابی کی، ساتھ صبح و شادمانی کے مبدّل ہو۔"

"باغ و بہار" میں شروع سے آخر تک طول و اختصار کے اس توازن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ میرامّن کو ایک اچھے قصہ گو کی طرح اس بات کا علم ہے کہ قصّے میں کس بات کو بڑھا کر اور کسے گھٹا کر بیان کرنا ضروری ہے کس موقع پر بات میں طوالت پیدا کی جائے تو زیادہ موثر ہوگی اور کس جگہ اختصار سے کام لیا تو لطفِ داستان میں اضافہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ فارسی قصّے کو اُردو کا لباس پہناتے وقت یا تحسین کی نوطرز مرصّع کو ایک نئے سانچے میں ڈھالتے وقت انہوں نے تفصیلات و جزئیات کے ترک و اختیار کے معاملے میں اپنی مرضی اور حُسنِ توازن کو اپنا رہنما بنایا ہے اور یہ چیز 'باغ و بہار' کا ایک ایسا امتیاز بن گئی ہے جس سے میرامّن کے عہد کی اور اس کے بعد والی تمام داستانیں خالی ہیں۔ اسی لیے کہ ان سب کا مطمحِ نظر صرف یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو قصے کو طول دیا

جائے۔[1]

باغ و بہار میں حُسنِ توازن اور فنّی احساس کے وجود کا اظہار ایک اور طرح بھی ہوتا ہے۔ میرامّن نے اپنی پوری داستان بڑے دھیمے انداز سے شروع کی ہے اور واقعات کے بیان اور کرداروں کے عمل اور ردِّ عمل کے اظہار میں اپنی رفتار کو برابر متوازن اور ہموار رکھا ہے۔ واقعات کی جُزئیات اور کرداروں کے عمل اور ردِّ عمل کی تفصیلات کو انہوں نے ایک ایسی رفتار سے بیان کیا ہے جس میں نہ کہیں تیزی اور جلد بازی ہے اور نہ تھکن۔ ہر چیز اُسی محل پر آتی ہے جہاں اُسے آنا چاہیے اور اسی رفتار سے آتی ہے جس سے آنا چاہیے اس لیے قصہ پڑھنے والے کو بہت کم یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعات اور کردار قصہ گو کے اختیار اور قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ وہ برابر اُس کے حلقہ بگوش نظر آتے ہیں اور اُن سے وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق وہی کام لیتا ہے جس سے اس کے نزدیک قصہ موثر اور دلچسپ بنے گا۔ میرامّن کی تخلیق کے عمل میں عموماً اور قصے کے تخلیقی عمل میں خصوصاً رفتار کا توازن لکھنے والے اور پڑھنے والے کے نقطۂ نظر سے یکساں اہم ہوتا ہے۔ اس توازن کی کمی اکثر و بیشتر فن کار میں تھکن کے آثار پیدا کر کے اُس کی توجہ اور انہماک میں مخل ہوتی ہے اور اس کا اثر کہانی پڑھنے والے یا سُننے والے پر یہ پڑتا ہے کہ ذہنی طور پر اُسے کہانی کی غیر متوازن رفتار سے ہم آہنگ ہونے میں دشواری پیش آتی ہے۔ دشواری کا یہی احساس اُس کے لیے کہانی میں دلچسپی کی کمی کا باعث بنتا ہے۔ میرامّن نے

---

[1] اس محل پر میرامّن کے معروف معاصر داستان گو حیدر بخش حیدری کے وہ الفاظ جو اُنہوں نے 'آرائشِ محفل' کے دیباچے میں لکھے ہیں، قابلِ توجہ ہیں:

"یہ قصہ عبارت فارسی میں زبان سلیس سے کسی شخص نے آگے لکھا تھا، اب اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری دلّی کے رہنے والے نے — زبان ریختہ میں موافق اپنے طبع کے اس کتاب سے (جو ہاتھ لگی تھی) ترجمہ نثر میں کیا اور نام اس کا آرائش محفل رکھا، پر اکثر اس میں زیادتیاں اپنی طبیعت سے بھی جہاں جہاں موقع اور مناسب پایا، وہاں کیں، تاکہ قصہ طولانی ہو جائے اور سُننے والوں کو خوش آئے۔"

داستان گوئی میں رفتار کا یہ توازن عموماً برقرار رکھا ہے۔ خصوصاً ابتدائی تین قصّوں میں یہ چیز پوری طرح جاری و ساری ہے۔ چوتھے اور پانچویں قصّوں میں البتہ کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ قصّہ داستان گو کی اُس توجہ سے محروم رہا ہے جو اُسے ابتدائی داستانوں میں حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کی رفتار میں کہیں کہیں وہ دھیما پن اور کرداروں کے مزاج اور عمل میں وہ نرمی اور اعتدال موجود نہیں جو انہیں حقیقی زندگی اور قوانینِ فطرت کی حدوں میں رکھتا ہے۔ دوسرے داستان گویوں کے برخلاف میرامّن نے فوق الفطرت عناصر اور اتفاقات و حوادث سے بہت کم مدد لی ہے۔ چوتھے اور پانچویں قصّے میں البتہ اُنہیں بعض ایسی چیزوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ اس کی وجہ بھی بظاہر توجہ اور انہماک کی وہ کمی ہے جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا۔

داستان کی حیثیت سے باغ و بہار کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ وہ غیر فطری عناصر سے خالی ہونے کے باوجود سُننے اور پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ ہے۔ یہ دلچسپی جیسا کہ بیان کیا گیا میرامّن کے اسلوبِ نگارش، روزمرّہ اور محاورے پران کی قدرت، داستان کے گہرے تہذیبی اور معاشرتی رنگ، واقعہ نگاری اور کردار نگاری میں طولُ اختصار کے صحیح امتزاج، قصّوں کی متوازن رفتار اور غیر فطری عناصر کے بجائے فطرت اور حقیقت سے قریب رہنے کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ لیکن ان عناصر کے علاوہ بھی دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کے برتنے میں میرامّن نے توازن سے کام لے کر 'باغ و بہار' کو عوام اور خواص دونوں کے لیے پسندیدہ بنایا ہے۔ ان دو ایک باتوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ میرامّن نے اپنے قصّوں کو پند و موعظت کا دفتر بنانے کے بجائے انھیں بنیادی طور پر قصہ رکھا ہے۔ نصیحت کی باتیں کہیں ضرور ہیں لیکن عموماً قصہ گو کے منصب کو فراموش نہیں کیا اور اخلاقی درس دینے میں اختصار کو اپنا معمول بنایا ہے۔ قصّے کے بیچ بیچ میں وہ کوئی نیکی کی بات کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس جگہ دیر تک ٹھہرتے نہیں۔ اس معاملے میں کہیں کہیں البتہ وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکے۔ 'باغ و بہار' میں دو ایک موقعے ایسے آتے ہیں جب اُنہیں دوسرے مذاہب کے

مقابلے میں اسلام کی برتری کے اظہار کا موقع مل جاتا ہے۔ اس جگہ اُنھوں نے اس اعتدال اور توازن سے کام نہیں لیا جو اُن کے فن کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس معاملے میں راہِ اعتدال سے بھٹک کر جذبات کی دکھائی ہوئی ڈگر پہ چلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض ناقدین کو یہ بات کھٹکی ہے اور انھوں نے 'باغ و بہار' کی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ میرامّن کی اس فنّی بے اعتدالی کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان ناقدین میں سب سے اہم نام معروف فرانسیسی مستشرق گارسن دتاسی کا ہے جس نے اپنے خطبات میں دو جگہ 'باغ و بہار' کا ذکر کیا ہے اور ان دو موقعوں میں سے ایک پہ 'باغ و بہار' کے اس تبلیغی رنگ کی مذمّت کی ہے۔

اس ضمن کی دوسری چیز 'باغ و بہار' کا جنسی پہلو ہے۔ معاملاتِ حسن و عشق کے بیان کرنے میں بھی میرامّن نے عموماً ذوق کی شائستگی کو دخل دیا ہے اور اس معاملے میں کہیں اپنے تخیل کو بے باک اور بے قابو نہیں ہونے دیا۔ دو ایک موقعے البتہ ایسے آتے ہیں جہاں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا جنسی معاملات کے ذکر میں لذّت محسوس کر رہا ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو ایسے موقعوں پہ میرامّن کی تھوڑی سی بے باکی یا بے اعتدالی کا جواز قصّے کے محل میں موجود ہے۔ یہ ہلکی سی بے اعتدالی قصّے کے اعتبار سے اُس خاص محل کا تقاضا ہے جہاں وہ برتی گئی ہے۔

'باغ و بہار' میں بعض باتوں کی کمی البتہ ہے۔ اُس میں مزاج کی شگفتگی تقریباً نابید ہے۔ اس میں وہ شاعرانہ ماحول بھی سرے سے مفقود ہے جس سے داستان گو اپنی نرم خیالی کو روشن کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو 'باغ و بہار' کی یہ کمی بھی اُس کا ایک امتیاز ہے اور میرامّن کے مجموعی اسلوب سے مطابقت رکھتا ہے۔ میرامّن نے اپنے فن کو ہر جگہ فطرت کے حدود میں رکھا ہے اُس پر کسی جگہ کسی طرح کے تصنّع کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ بلا ضرورت مزاح پیدا کرنے کی کوشش اور عبارت میں دلکشی پیدا کرنے کے لیے اشعار یا شاعرانہ ترکیبوں کا استعمال بھی ایک طرح کا تصنّع ہے اس لیے وہ 'باغ و بہار' میں موجود نہیں اور اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ 'باغ و بہار'

داستان کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے ساتھ ساتھ فطرت کے تقاضوں کو بھی پُورا کرتی ہے اور اس طرح وہ اُردو کی سب سے فطری داستان ہے۔

گنجِ خوبی : میر امن کی دوسری تالیف "گنجِ خوبی" ہے۔ یہ کتاب اس قدر غیر معروف ہے کہ بالعموم لوگ جو میر امن کے ساتھ اس کا نام بھی نہیں لیتے۔ اس کی جو تھوڑی بہت تفصیلات ملتی ہیں اُن کا ماخذ "ارباب نثر اُردو" ہے[1]۔ صاحبِ اربابِ نثر اُردو کو ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء کا چھپا ہوا ایک نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ملا۔ اس نسخہ کے مطالعے کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کتاب میر امن نے "باغ و بہار" ختم کر چکنے کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ترجمہ کی تھی۔ کتاب ملا حسین الواعظ کاشفی کی مشہور اخلاقی کتاب "اخلاقِ محسنی" کا ترجمہ ہے۔ میر امن نے کتاب کے دیباچے میں یہ عبارت لکھی ہے :

"سنہ ایک ہزار دو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں، اس واسطے اس کا نام گنجِ خوبی رکھا۔"

ترجمے کے سلسلے میں میر امن نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :

"فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا، اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورے میں سارا احوال بیان کیا۔"

اس مختصر سے ٹکڑے سے میر امن کے مزاج کی نزاکت اور نفاست کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[1] "گنجِ خوبی" کے بارے میں اب قیمتی معلومات کے لیے رجوع کیجیے : مقدمہ "گنجِ خوبی" مطبوعہ دہلی ۱۹۶۶ء۔ "گنجِ خوبی" کے محولہ ایڈیشن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا متن میر امن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کے مطابق ہے اور جس کو ضروری حاشیوں، نسخوں کے اختلافات، فرہنگ اور مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اکتوبر ۱۹۶۶ء میں شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی کی جانب سے شائع کیا ہے۔ (مرتب)

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بڑی مشکل بات ہے اس لیے کہ ترجمے میں ترجمہ کرنے والے کو دو باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اچھے ترجمے کی پہلی ضروری بلکہ لازمی شرط تو یہ ہے کہ ترجمہ خیال اور اندازِ فکر کے اعتبار سے پوری طرح اصل سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس میں کسی جگہ اصل کی رُوح سے سرِ مو انحراف نہ کیا گیا ہو اور دوسرے یہ کہ ترجمہ کرتے وقت اس بات کا لازمی طور پر خیال رکھا جائے کہ ایک زبان کے روزمرہ اور محاورے کو اس طرح دوسری زبان کے روزمرہ اور محاورے میں منتقل کیا جائے کہ ترجمے کی زبان میں سلاست اور روانی کی ذرا بھی کمی محسوس نہ ہو اور ترجمے کی زبان کے قواعد میں بھی کوئی فرق پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طرح میر امن نے ترجمے کے بالکل ابتدائی دور میں ترجمے کے دو ایسے اصولوں پر زور دیا جو اچھے ترجمے کی بنیاد اور ان کی جان ہیں۔

"گنجِ خوبی" کی عبارت میں کس حد تک اُردو روزمرہ کی پابندی کی گئی ہے اور اس میں کس درجہ سلاست و روانی ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے ایک اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے :

"کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزلِ باقی میں پہنچایا کسی شخص نے اُنھیں خواب میں دیکھا اور پوچھا 'کہو، مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گزری اور اب کیا حال ہے۔' جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عتاب کے پنجے میں اور سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا۔ ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا اور سارے گناہ معاف ہو گئے، سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب اور باعث ہے، کچھ تمہیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلے سے نجات پائی؟ بولے کہ ایک میدان میں مسافر خانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تپتا ہوا اس کے سایہ میں آن کر

بیٹھا۔ اُس نے کوئی دم آرام کیا۔ جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی ماندگی سے ہرا ہوا خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دُعا کی کہ اے بارِ الٰہا! اس مکان کے بنا کرنے والے کے گناہ بخش اور اس کی رُوح کو فردوس کی چھاؤں میں جگہ دے۔ وہیں اُس کی دُعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پہ درست بیٹھا۔ میری آمُرزش ہوئی اور جہنّم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفوں میں رہنے کا حکم ہوا۔ بیت:

ہر چند کہ سب کاموں میں مَیں غور کروں ہوں
نیکی ہی بھلی سب میں ہے اور باقی ہے سب لُچ" [1]

دیوان: میر امّن، امّن اور لطف دونوں تخلص کرتے تھے۔ لیکن بقول صاحب اربابِ نثرِ اُردو، وہ کوئی "باضابطہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری اُن کا پیشہ تھی۔ انھیں کے بیان کے مطابق ڈاکٹر فیلن نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ میر امّن خود کہا کرتے تھے کہ "شاعری میرا پیشہ نہیں ہے۔ نہ میں کسی شاعر کا بھائی۔ میری اُردو ٹکسالی اُردو ہے کیونکہ میں دلّی کا روڑا ہوں اور یہیں کا پروردہ یافتہ ہوں"۔

اربابِ نثرِ اُردو میں "گنج خوبی" کے دیباچہ کے مندرجہ ذیل الفاظ منقول ہیں ان سے فیلن کے بیان کی تائید ہوتی ہے:

"اگرچہ فکرِ سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی، ہاں مگر خود بخود جو کوئی مضمون

[1] "گنج خوبی" مطبوعہ مطبع محبوب، بمبئی ۱۲۹۲ ہجری مطابق ۱۸۷۵ء

گارسن دتاسی نے اپنی تاریخ ہندوستانی میں "گنج خوبی" کے متعلق لکھا ہے کہ یہ کتاب کلکتہ سے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئی تھی اور ایک قلمی نسخہ فارسی رسم الخط میں سینڈ فورڈ ارناٹ کے پاس بھی موجود تھا۔ یہ کتاب اعلیٰ درجہ کی شائستہ زبان اور فارسی محاورے میں ہے۔ میر امّن نے اسے عام فہم بنانے کے لیے عربی کے الفاظ بہت کم استعمال کیے ہیں اور قرآن و حدیث کے حوالے بھی حتی الامکان کم دیے ہیں۔ یہ کتاب کلکتہ میں غلام حیدر نے ہُگلی سے بڑی تقطیع کے ۳۹۶ صفحوں پر شائع کی تھی۔

دل میں آیا تو اُسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا اُستاد نہ کسو کا شاگرد۔ بیت

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی

دتاسی نے بھی اپنی تاریخ ہندوستانی میں باغ و بہار اور گنج خوبی کے ذکر کے ساتھ میر امّن کے شاعر ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور گنج خوبی کے مؤلف میر امّن کا تذکرہ کرتے کرتے لکھا ہے کہ یہ غالباً وہی میر امّن ہیں جن کا ایک دیوان بھی فورٹ ولیم کالج میں موجود تھا۔ مسٹر رومر [1] کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ تھا۔

ان سب بیانات سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میر امّن جیسے پاکیزہ مذاق رکھنے والے شخص کا شاعر ہونا یقیناً قرینِ قیاس ہے لیکن اُن کی توجہ چونکہ شعر کے بجائے نثر کی طرف تھی اس لیے شاعری اُن کی توجہ اور انہماک سے محروم رہی۔ یوں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کبھی کبھار کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ شاعری کی طرف سے اُن کی بے توجہی اور کم تعلقی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اپنے آپ کو استادی شاگردی کے رسمی تعلق سے بیگانہ رکھا۔ تذکرہ نویسوں کا ایسے شاعر کی طرف سے اغماض برتنا کوئی حیرت کی بات نہیں اور نہ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ انھوں نے شوق سے کہے ہوئے اشعار سے دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ اس لیے کہ شعر کہنا اور دیوان مرتب کرنا تو اُس زمانہ کا ایک تہذیبی مشغلہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں اور رومر کے پاس جن دیوانوں کی موجودگی کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یقین ہے کہ زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے اس لیے نہ عام نظروں سے گزرے اور نہ اُن کا ذکر عام طور سے کیا گیا۔ ممکن ہے تحقیق کی نظرِ جستجو کبھی اس پوشیدہ خزانے کو منظرِ عام پر لا سکے۔

[1] یہ وہی مسٹر رومر ہیں جو میر امّن کے شاگرد بھی تھے اور جن کے پاس میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا "باغ و بہار" کا ایک نسخہ موجود تھا۔ اسی نسخے سے ڈنکن فاربس نے اپنا باغ و بہار کا نسخہ مرتب کیا تھا۔

سید حیدر بخش حیدری :

اٹھارویں صدی اور اُنیسویں صدی کے اکثر ادیبوں اور شاعروں کی طرح حیدر بخش حیدری کے حالات اُردو کے مشہور تذکروں میں نہیں ملتے۔ اِکّا دُکّا تذکروں میں زیادہ سے زیادہ ایک دو سطریں نظر آتی ہیں۔ مثلاً فسّاخ نے اپنے تذکرے 'سخن شعرا' میں صرف دو سطریں لکھی ہیں اور نمونۂ کلام کے طور پر ایک شعر نقل کر دیا ہے :

"حیدری تخلص۔ حیدر بخش دہلوی ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں تھے۔ اُن کی آرائش محفل یعنی ہفت سیرِ حاتم نظر سے گزری۔"[1]

نمونۂ کلام کے طور پر یہ شعر منقول ہے ؎

برابری کا تری گُل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ مُنہ اُس کا لال کیا[2]

'ریاض الوفاق' مولفہ ذوالفقار علی مست تالیف (۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)

---

[1] تذکرہ سخن شعرا، طبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۴ء، ص ۱۴۳۔
[2] لطف کی بات یہ ہے کہ یہ شعر بھی سودا کے شعر کی تحریف شدہ صورت ہے

کلکتہ اور بنارس کے فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اس تذکرے میں حیدری کے متعلق لکھا گیا ہے کہ حیدری ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء میں بنارس میں تھے اور کچھ عرصہ تک فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے۔"

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حیدری ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء سے پہلے ہی کالج کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر بنارس واپس آ گئے تھے۔

اُن کی زندگی کے سلسلے میں ایک اور شہادت ڈاکٹر اسپرنگر کی دی ہوئی ہے۔ اُنھوں نے حیدری کے دوست منشی غلام حیدر کی زبانی (جو فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے) بیان کیا ہے کہ حیدری کا انتقال ۱۸۲۳ء میں ہوا تھا۔

ان مختصر حالات کے علاوہ[1] بعض جستہ جستہ چیزیں اُن کی مختلف کتابوں کے دیباچوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ جو باتیں ان دیباچوں سے اخذ کی گئی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے :

حیدری دہلی میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کی تاریخ ولادت کہیں سے دستیاب نہیں ہوتی۔ ان کے آبا و اجداد کا وطن نجف اشرف تھا۔ وہ عرصہ ہوا دہلی[2] میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے والد سید ابوالحسن نے دہلی کی تباہی کے دنوں میں معاش سے پریشان ہو کر دلی چھوڑ دی اور لالہ سُکھ دیو رائے کے ساتھ بنارس چلے گئے۔ بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں خلیل[3] ناظم عدالت تھے۔ سید ابوالحسن کی ملاقات

---

[1] "گل مغفرت" (حیدری) کے مقدمے میں ڈاکٹر ناظر حسن زیدی نے حیدر بخش حیدری کے حالات سے تعرض کیا ہے (گل مغفرت، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۶-۹) (مرتب)
[2] زمانے کا تعین کسی طرح نہیں کیا جا سکا۔
[3] نواب علی ابراہیم خاں خلیل صوبہ بہار کے ایک معزز رئیس تھے اور سرکار نے انھیں امین الدولہ نصیر جنگ بہادر کا خطاب دیا تھا۔ وہ عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز نے انھیں بنارس کا صدر ناظم فوجداری مقرر کیا تھا۔ ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں بنارس میں ان کا انتقال ہوا ——— (باقی اگلے صفحے پر)

اُن سے ہوگئی اور انہوں نے حیدری کو اُن کے سایۂ تربیت میں دے دیا۔ حیدری نے اُن کی خدمت میں علوم متعارفہ میں دستگاہ حاصل کی۔ اُنھیں کے فیضِ صحبت سے اُن کے مذاق شاعرانہ کو بھی جلا ملی۔ نواب صاحب نے حیدری کو قاضی عبدالرشید کے ماتحت کسی خدمت پر مامور کر دیا۔ قاضی صاحب اپنے زمانے کے متبحّر عالم تھے۔ حیدری نے اُن سے عربی و فارسی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں مولوی غلام حسین غازی پوری سے جو نواب صاحب کی عدالت میں کسی خدمت پر مامور تھے، حدیث، فقہ، تفسیر و سیرت کی تعلیم پائی۔

یہی زمانہ تھا جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تھا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کو اُردو کے اچھے انشا پردازوں کی تلاش تھی۔ حیدری بھی وہاں کی ملازمت کے

(گزشتہ صفحے سے پیوستہ) — نواب علی ابراہیم خاں فارسی کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ کئی قابلِ قدر کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے۔ ان تصانیف میں سب سے مشہور ان کا تذکرہ گلزارِ ابراہیم ہے جو انھوں نے ۱۲ سال کی محنت کے بعد ۱۱۹۸ھ میں مکمل کیا تھا۔ اس تذکرہ میں نواب صاحب نے اُردو کے تقریباً تین سو شاعروں کے حالات فارسی میں لکھے ہیں اور اُن کے کلام کا نمونہ بھی درج کیا ہے۔ اُردو کے معروف تذکرے گلشنِ ہند (مولفہ مرزا علی لطف) کی بنیاد یہی تذکرہ ہے۔

تذکرہ گلزار ابراہیم کے علاوہ ان کی دوسری اہم تصانیف یہ ہیں :

(۱) خلاصۃ الکلام (۲) صحفِ ابراہیم (۳) وقائع جنگِ مرہٹہ (۴) حالات سرکشی والیٔ بنارس، (۵) مجموعۂ خطوط۔ ۱، ۲ شعرائے فارسی کے تذکرے ہیں ۵ خطوط کا مجموعہ ہے، جو برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور اس سے اٹھارویں صدی کے بعض تاریخی واقعات اور معاشرتی حالات کے سلسلے میں بعض اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ (مولف)

تذکرہ 'گلزار ابراہیم' کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :

(i) اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، لاہور، ۱۹۷۲ء ص ۱۹۲-۱۹۶

(ii) شعرائے اُردو کے تذکرے، ڈاکٹر حنیف نقوی، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۴۸۹-۵۱۱

(مرتب)

خیال سے عازم کلکتہ ہوئے اور رسائی کی تقریب کی غرض سے اپنے ساتھ ایک قصہ لکھ کر لیتے گئے[۱]۔ اس قصہ کا نام قصۂ مہر و ماہ تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو یہ قصہ بہت پسند آیا اور اُنھوں نے حیدری کو کالج میں ملازم رکھ لیا۔ تذکرۂ ریاض الوفاق کی روایت کے مطابق ۱۸۱۴ء سے پہلے وہ کالج کی ملازمت ترک کر کے بنارس واپس آچکے تھے اور منشی غلام حیدر کی روایت کے مطابق انھیں ۱۸۲۳ء میں انتقال کیا۔

فورٹ ولیم کالج کے مؤلفین میں حیدری کی تصانیف سب سے زیادہ ہیں اور ان تصانیف کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں نثر اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ اُن کی تالیفات کی مکمل فہرست یہ ہے :

(۱) قصۂ مہر و ماہ — یہ کتاب حیدری کی پہلی تصنیف ہے۔ ۱۲۱۴ھ کے شروع (یعنی ۱۷۹۹ء کے وسط میں) لکھی گئی۔ یہ کتاب مطبوعہ یا قلمی صورت میں کہیں دستیاب نہیں[۲]۔

(۲) قصۂ لیلیٰ مجنوں — امیر خسرو کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ ہے۔ ۱۲۱۴ھ/۱۸۰۰ء میں مکمل ہوا۔ لیکن یہ بھی مہر و ماہ کی طرح کہیں نہیں ملتا[۳]۔

---

[۱] حیدری کے احوال و کوائف کے بارے میں مزید مطالعہ کے لیے رجوع کیجیے :

(i) کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر وحید قریشی، مکتبہ ادب جدید، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۳-۱۸۰

(ii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، نصرت پبلشرز، لکھنؤ ۱۹۸۳ء ص ۱۳۳-۱۳۹، ۲۸۳-۳۰۰، ۳۵۸-۳۶۱، اور صفحہ ۳۶۵-۳۹۹۔ [مرتب]

[۲] ڈاکٹر گیان چند نے اُردو کی نثری داستانیں میں لکھا ہے کہ برٹش میوزیم میں فارسی مہر و ماہ کے دو نسخے موجود ہیں۔ اس میں خاور شاہ کے لڑکے مہر اور شہزادی ماہ کی محبت کا قصہ ہے۔ ان دو نسخوں میں سے ایک نسخہ ۱۱۷۴ھ (۱۷۵۹-۶۰ء) میں پانی پت میں لکھا گیا۔ حیدری کا ترجمہ گم ہو گیا ہے۔

[۳] مہر و ماہ اور لیلیٰ مجنوں، ان دونوں قصوں کو بالکل ناپید، مفقود اور نایاب بتایا جاتا ہے :

(i) ارباب نثر اردو، ص ۱ (ii) ڈاکٹر وحید قریشی، تو تا کہانی، ص ۵۳-۵۴ (iii) ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، آرائش محفل ص ۳۴ (iv) ڈاکٹر گیان چند، اُردو، کراچی، جنوری ۱۹۵۱ء، ص ۹۵ (v) ڈاکٹر گیان چند، اردو کی نثری داستانیں، طبع دوم، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۲۰۱، ۲۶۸

ڈاکٹر عبادت بریلوی کو ان قصوں کا کچھ سراغ ملا ہے، دیکھیے : اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری ۱۹۶۴ء ص ۱۱ و مابعد [مرتب]

(۳) ہفت پیکر — نظامی گنجوی کی اسی نام کی مثنوی کے جواب میں لکھی گئی۔ مرزا کاظم علی جوان نے اس کی تاریخ کہی۔ تاریخ کا مصرعہ ہے ع جانِ تازہ ہفت پیکر یہ ہوئی۔ اس سے ۱۲۲۰ھ (مطابق ۱۸۰۵ء) تاریخ نکلتی ہے۔ یہ مثنوی بھی اب ناپید ہے۔ صاحبِ اربابِ نثرِ اُردو کا خیال ہے کہ یہ مثنوی شائع نہیں ہوئی۔ اُنھیں کی روایت کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں موجود تھا

(۴) تاریخِ نادری — یہ کتاب مرزا محمد مہدی ابن محمد نصیر استرآبادی کی فارسی تصنیف "تاریخ جہاں کشائے نادری" کا ترجمہ ہے۔ چونکہ کتاب "تاریخِ نادری" کے نام سے معروف ہے اس لیے حیدری نے بھی یہی نام رکھا۔ کتاب کا ترجمہ ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں ختم ہوا لیکن یہ کتاب بھی نایاب ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب اس لیے قابلِ قدر ہے کہ اس کا مصنف مہدی نادر شاہ کا مصاحب تھا اس نے اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی بنا پر اس کتاب میں اپنے آقا کی وفات تک کے حالات لکھے ہیں۔

(۵) گلزارِ دانش — یہ کتاب شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی تصنیف بہارِ دانش کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب بھی چونکہ نایاب [1] ہے اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ حیدری نے ترجمہ کس سنہ میں کیا۔ عنایت اللہ کی بہارِ دانش کے متعلق البتہ یہ معلوم ہے کہ اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کی محبت اور جہاندار شاہ کی مہموں کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کی ضخامت کئی سو صفحے ہے اور یہ ۱۰۶۱ھ (مطابق ۱۶۵۱ء) کی تالیف ہے۔ مولّف نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ حسن و عشق کی یہ کہانی اُس نے کسی ترجمان برہمن کی زبانی سُنی اور اسے تالیف کر دیا۔

اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ "فارسی بہارِ دانش شیخ عنایت اللہ کنبوہ دہلوی نے ۱۶۵۱ء میں تصنیف کی۔ اس نے بعض حصّوں میں ہندو قصّوں سے مدد لی مثلاً چار عورتوں کی فحش کہانیاں۔ بہارِ دانش سے اُردو

---

[1] گلزارِ دانش (حیدری) کو ڈاکٹر عبادت بریلوی یونیورسٹی اورینٹل کالج کی جانب سے شائع کر چکے ہیں۔ دیکھیے: پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کیٹلاگ نمبر ۴۳۳۳ ۱۸۹ح ۹۱ گ [مرتب]

کے بہت سے قصّوں میں مدد لی گئی ہے [1]

(۶) گلدستۂ حیدری — حیدری کی مختلف متفرق تالیفات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۲۱۷ ہجری میں مرتب کیا تھا۔ [2] یہ مجموعہ بھی چھپا نہیں [3] لیکن کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کے مختلف حصّوں کی مندرجہ ذیل تفصیل اُربابِ نثرِ اُردو' میں درج ہے:

(الف) مجموعہ مراثی — حضرت امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کے مرثیے۔

(ب) مجموعۂ حکایات — اس میں حیدری نے اپنے مختصر حالات بھی لکھے ہیں اور سو سے زیادہ قصّے اور لطیفے یکجا کیے ہیں۔

(ج) قصّۂ مہر و ماہ کا دیباچہ۔

(د) قصّۂ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ۔

(ہ) دیوانِ غزلیات — جس میں غزلوں کے علاوہ قطعے، قصیدے اور متفرق نظمیں شامل ہیں۔

گلدستۂ حیدری کے بعض نسخوں میں ایک حصہ اور شامل ہے۔ یہ حصّہ اُردو شاعروں کا تذکرہ ہے اور حقیقت میں ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا علی لطف کے تذکرے کی طرح حیدری نے بھی اس کا نام "گلشنِ ہند" رکھا تھا اور دونوں تذکرے ایک سال کے فرق سے تالیف ہوئے تھے۔ [4] اس تذکرے کا ذکر ارباب

---

[1] اُردو کی نثری داستانیں (پہلا ایڈیشن) صفحہ ۲۰۶

[2] اس کی تاریخ تدوین اس مصرعے سے نکلتی ہے ع بنا تازہ گلدستۂ حیدری

[3] صاحبِ اربابِ نثرِ اُردو اسے غیر مطبوعہ قرار دیتے ہیں۔ گلکرسٹ کی ایک یادداشت ۹ اگست (یا ۱۹ اگست) ۱۸۰۳ء کے مطابق مطبوعہ ہے۔ دیکھیے: گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، طبع دوم، دہلی ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۴۷، صفحہ ۱۴۵ [مرتب]

[4] حیدری اور لطف کے تذکروں کی تاریخیں یہ ہیں:

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب

زروئے حق یہ بولے شیخ اور زمر
اسے کہتا ہے ہر اک گلشنِ ہند

۱۲۰۶ + ۸ = ۱۲۱۴ھ / ۱۸۰۰

(باقی اگلے صفحے پر)

نثرِ اُردو اور داستانِ تاریخِ اُردو میں ایک علیٰحدہ عنوان کے تحت ہوا ہے۔ ہم بھی اس کا تذکرہ علیٰحدہ کرتے ہیں۔

(۷) **گلشنِ ہند** : حیدری کا یہ تذکرہ چھپا نہیں [۱]۔ ہندوستان اور پاکستان کے کتب خانوں میں بھی اس کے نسخے دستیاب نہیں ہیں البتہ "ارباب نثرِ اردو" کے حوالے مطابق آکسفورڈ یونیورسٹی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں حیدری کے تذکرے کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ ڈاکٹر ڈنکن فاربس نے اپنی مرتبہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے۔ برٹش میوزیم میں بھی ایک نامکمل نسخہ موجود ہے۔ اس کا ذکر بلوم ہارٹ نے اپنی فہرستِ مخطوطات میں کیا ہے۔[۲]

ڈاکٹر محی الدین زورؔ نے صاحبِ "ارباب نثرِ اردو" کی فرمائش پر برٹش میوزیم والے نسخے کا ایک اقتباس اُنھیں بھیجا تھا۔ وہ اقتباس "ارباب نثرِ اُردو" میں موجود ہے۔ وہیں سے اس جگہ منقول ہے :

" افسوسؔ تخلص، نام شیر علی اور ان کے بزرگ کا نام مظفر علی خاں۔ ہم جلیس میر حیدر علی خاں حیرانؔ۔ بالفعل مسندِ حیات پر موجود ہیں اور شعر اس طرح کہتے ہیں ؎

(گذشتہ صفحے سے پیوستہ)

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا بلیّت ہے

حیران پھرے ہیں بے سروپا بہمن اور دے — تاریخ اس کی جب کے کہ "رشکِ بہشت" ہے

۱۲۲۴ — ۱۲

$$= \frac{١٢١٥ \text{ ھ}}{١٨٠١ \text{ ء}}$$

[۱] ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزوؔ نے اس تذکرے کا سراغ لگایا ہے اور اپنے عالمانہ مقدمے کے ساتھ "گلشنِ ہند" کو ۱۹۶۷ء میں علمی مجلس دلّی کی جانب سے شائع کر دیا ہے۔ (مرتب)

[۲] ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزوؔ نے گلشنِ ہند کے چار نسخوں کا سراغ دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، از: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۲۱ - ۲۲۵ [مرتب]

بزم میں اُس کی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں
چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا مُنہ تکتے ہیں

سوداؔ تخلص، نام میرزا محمد رفیع، ساکن دلّی۔ فخرِ شعرائے ہندوستان۔ طبع عالی رکھتے تھے۔ یہ اُن سے ہے ؎

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنّارِ تسبیحِ سلیمانی

احوالِ مؤلف : اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام معہ اشعار و تخلص کے جمع کیے اور کئی جزو بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے وہ جُزو حرفِ شں سے لے کر حرف ی تک خدا جانے کیا ہوئے۔ اس واسطے نوبتِ تحریر حرف ی تک نہ پہنچی۔ انشاء اللہ تعالےٰ اگر زمانہ اس صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے سے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے اور یہ جلد دو چار جُزو کی جو کلام و ابیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی کہ وہ دستگیرِ درماندگاں اور حامیٔ بے کساں ہے۔ اللہ تعالےٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اور مشکل کشائی مشکل کشا اُس کی کیا کرے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد" [۱]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدری کا تذکرہ بہت مختصر تھا۔ اس لیے کہ افسوسؔ اور سوداؔ کا ذکر جس سرسری انداز سے کیا گیا ہے اُس کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پورا تذکرہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ حیدری نے شں سے ی تک کے حصے گم ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر وہ اُسے دوبارہ مرتب نہیں کر سکے۔ لیکن اگر مرتب کر بھی لیتے تو وہ زیادہ ضخیم نہ ہوتا اور لُطفؔ کے تذکرے کے مقابلے میں جس کی ضخامت دو سو صفحے کے قریب ہے، اس کے صفحات کی تعداد کم ہی ہوتی

---

[۱] عبارت تذکرہ گلشنِ ہند قلمی نسخہ برٹش میوزیم بہ حوالہ "ارباب نثرِ اُردو" اشاعت دوم صفحہ ۸۸ و ۸۹

لیکن ایک لحاظ سے البتہ اس کی اہمیت اور قدر زیادہ ہوتی کہ لطف کے تذکرے کی زبان پُر تکلف اور پیچیدہ ہے اور حیدری کا عام اسلوب سادہ، سلیس، سلجھا ہوا اور سنجیدہ ہے اور تذکرہ نویسی کے لیے بے حد موزوں ہے۔[۵]

(۸) گلِ مغفرت : حیدری نے 'انوارِ سہیلی' اور 'اخلاقِ محسنی' کے مصنف و مؤلف

---

۵ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ : "گلدستۂ حیدری" جس کا ایک جزو "گلشن ہند" تذکرۂ شعرائے اُردو کے نام سے الگ شائع ہو چکا ہے ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء میں مکمل ہوا ہے۔ تذکرے کے آخر میں حیدری نے جو قطعہ تاریخ دیا ہے اس سے بھی یہی سال نکلتا ہے "ڈاکٹر مختار الدین احمد نے لکھا ہے کہ اس تذکرے کی ترتیب حیدری نے ۱۲۱۴ھ/۱۷۹۹ء میں شروع کی : "شعرائے اُردو کا یہ پہلا تذکرہ ہے جو فارسی کے بجائے اُردو میں لکھا گیا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ "گلشن ہند" نام (ہی) کا ایک تذکرہ مرزا علی لطف نے ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء میں مکمل کیا تھا۔ (یہ) تذکرہ دراصل "گلزارِ ابراہیم" کا ترجمہ ہے، اگرچہ مرزا علی لطف نے اپنی طرف سے بھی اس میں اضافے کیے ہیں۔ یہ پہلی بار ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ "گلدستۂ حیدری" کے تکملہ کا سال ۱۸۰۲ء/ ۱۲۱۷ھ اور طباعت کا زمانہ اگست ۱۸۰۳ء سے پہلے کا ہے اس لحاظ سے اُردو زبان میں شعرائے ریختہ کا پہلا تذکرہ "گلشن ہند" مولفہ مرزا علی لطف نہیں بلکہ "گلشن ہند" مولفہ حیدری قرار پاتا ہے"

[اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن' لاہور ۱۹۷۲ء ، صفحہ ۲۲۲ - ۲۲۳]

ڈاکٹر اقتدا حسن کا کہنا ہے کہ : "شعرائے اُردو کے تذکرے لکھنے کی جس روایت کا آغاز بارہویں صدی ہجری کے ساتویں عشرے میں ہوا، حیدری کا تذکرہ (گلشن ہند) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اپنی کوتاہیوں کے باوجود اس تذکرے کی اہمیت اس اعتبار سے مسلم ہے کہ اُردو زبان میں تذکرہ نگاری کی یہ پہلی مثال ہے۔ علی لطف اور بینی نرائن جہاں وغیرہ کی تالیفات اس کے بعد معرضِ وجود میں آئیں" دیکھیے: حیدری کا تذکرہ گلشن ہند' اُردو' کراچی' جولائی ۱۹۶۶ء' صفحہ ۷۸

[مرتب]

ملا حسین الواعظ کاشفی کی کتاب 'روضۃ الشہدا' کا ترجمہ اردو میں کیا تھا[۶] اور اس کا نام "گلشنِ شہیداں" رکھا تھا۔ 'گلِ مغفرت' اسی کا انتخاب ہے۔ اس کتاب میں شہدائے کربلا کے حالات درج ہیں۔ لیکن حیدری نے ترجمہ کرتے وقت اس میں جا بجا اپنی طرف سے اضافے کیے ہیں اور اس طرح یہ کتاب ترجمے کے بجائے تالیف بن گئی ہے۔ حیدری نے اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں یہ باتیں لکھی ہیں :

"صاحبانِ دردوغم و مبتلایانِ رنج والم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشنِ شہیداں سے جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبانِ ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سنہ بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب گلِ گلزارِ معانی، شمعِ بزمِ نکتہ دانی، بحرِ سیادت و امانت، سروِ جوئبارِ گلشنِ شرافت و نجابت، مولوی سید حسین علی صاحب زاد الطافہٗ کے

---

۶ روضۃ الشہدا، کاشفی کی بڑی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کے دس باب ہیں اس لیے اس کا نام "دہ مجلس" بھی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے جو مختلف ترجمے کیے گئے ان کا نام بھی اکثر دہ مجلس ہی رکھا گیا۔ فضلی کی دہ مجلس جس کا نام کربل کتھا بھی ہے اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

[مولف]

کربل کتھا (فضل علی فضلی) ایک مدت سے نایاب خیال کی جاتی تھی، اب یہ شائع ہو چکی ہے، دیکھیے:

۱۔ کربل کتھا، مرتبہ: مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین احمد' ادارۂ تحقیقات اُردو، پٹنہ، اکتوبر ۱۹۶۵ء

۲۔ کربل کتھا یعنی دہ مجلس' مقدمہ: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی' دہلی یونیورسٹی' دہلی مارچ ۱۹۶۱ء

۳۔ کربل کتھا، مقدمہ: ڈاکٹر احسان الحق' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور' ۱۹۸۲ء

[مرتب]

ارشاد کرنے سے، جن کی خدمتِ فیض درجت میں اس ہیچ مداں کو ایک رسوخِ دلی و نیازِ باطنی ہے اس نسخۂ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا "گل مغفرت" رکھا۔ اس لیے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظرِ اشرف سے گزرے، مقبولِ خاطر ہووے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد"۔

"گل مغفرت" حیدری کی آخری تالیف ہے۔ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء میں لکھی گئی اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی۔ گل مغفرت بھی حیدری کی دوسری کتابوں کی طرح اب کہیں نہیں ملتی۔[1] اربابِ نثرِ اردو میں اس کی عبارت درج ہے، وہ نمونے کے طور پر اس جگہ درج ہے:

"کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہلِ بیتِ رسالت کے ہوا خواہو! اے آلِ عبا کے ماتم دارو! ماہِ محرم میں گریہ و زاری کرو۔ خوشی و خرمی کو دل میں راہ نہ دو۔ حق تعالےٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجرِ عظیم دے گا۔ بہشتِ بریں سا مکان عطا فرمائے گا۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول و دستور تھا کہ جب کوئی امیر سو سوار مکمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا ایک گرز طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اُس کے لشکر کی نظر ثانی ہوئی۔ ایک سو چوبیس سردار صاحب گرز شمار کیے گئے۔ عمرو لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تلک رویا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا 'اے بادشاہ! تجھے کیا ہو گیا۔ ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا؟' اس نے کہا 'اے وزیر، نیک تدبیر یہ فوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا اور جی میں یہ گزرا کہ اس لشکرِ فتح پیکر سے جناب سید الشہدا کے ساتھ کربلائے معلیٰ میں

[1] گل مغفرت (حیدری) ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کے مقدمے (ص ۳-۳۷) کے ساتھ مجلس ترقیٔ ادب لاہور کی جانب سے جنوری ۱۹۶۵ء میں چھپ چکی ہے۔ [مرتب]

ہوتا تو ان کافروں بدنہادوں کو مارتا۔ آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اُسے خواب میں دیکھا کہ ایک تاج مرصع سر پہ دھرے خلعتِ شاہانہ پہنے کارچوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے، حور و غلمان اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک اسپِ خوش خرام پہ سوار ہے اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے۔ پوچھا۔ اس نے کہا 'اے شخص! پہلے میں غضبِ الٰہی میں گرفتار ہوا تھا۔ بعض اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم و الم کرنے اور آپ کے حالِ زار پر رونے کے صدقے سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا اور آپ کا رنج و الم یاد کر کے روئے گا، یہ گریہ و زاری حشر کے دن اس کے کام آوے گی۔ موجبِ نجات کا ہوگا"۔

(گلِ مغفرت صفحہ ۱۳۷)[1]

اب تک حیدر بخش حیدری کی جن کتابوں کے اقتباسات ہماری نظر سے گزرے انھیں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ سادگی و سلاست حیدری کے طرزِ بیان کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھائیں اپنے خیالات کو سلیس اور سیدھی سادی عام فہم زبان میں بڑی روانی اور بے تکلفی سے بیان کر دیتے ہیں۔ گو میر امن کی طرح ان کی زبان میں محاورے کا چٹخارہ نہیں لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سادہ طرز کو ہر ایک اختیار کر سکتا ہے۔ میر امن کی سادگی سہلِ ممتنع ہے اس لیے آج تک کوئی اس کی کامیاب پیروی نہ کر سکا۔ حیدری نے جو اسلوب اختیار کیا وہی زمانے کا عام اسلوب بنا اور اُسی کی بدولت اُنیسویں صدی کے بالکل شروع میں یہ بات روشن ہو گئی کہ سادہ اور سلیس اُردو میں ہر طرح کے خیالات ادا کیے جا سکتے ہیں۔ حیدری نے جو صاف، سلجھی ہوئی، سادہ اور سنجیدہ نثر اختیار کی وہ قصہ گوئی کے لیے بھی اُتنی ہی موزوں ہے جتنی تاریخ، سیرت، تذکرے اور مذہبی موضوعات کے اظہار

[1] بہ حوالہ اربابِ نثرِ اُردو صفحات ۸۲ و ۸۳

کے لیے۔ اصل چیز یہ ہے کہ لکھنے والا اُردو کے مزاج کو پہچانتا ہو۔ اور بے تکلفی کے ساتھ فارسی، عربی اور ہندی کے الفاظ کو شیر و شکر کرے۔ زبان کے استعمال میں قواعد کی صحت کو محاورے کی چاشنی اور چٹخارے پر ترجیح دینا حیدری کے طرز کی ایسی خصوصیت ہے جس کی بدولت اُنھوں نے بھی اُردو کی نثر کی تاریخ میں اپنے لیے ایک مستقل جگہ بنائی ہے۔ اگر حیدری کی وہ سب تصانیف یا تالیفات جو اس وقت پردۂ خفا میں ہیں شائع ہو جاتیں تو یقیناً حیدری کا مرتبہ اُردو نثر میں اُس سے بڑا ہوتا جیسا کہ اب ہے۔ حیدری کی شہرت کا دار و مدار اُن کی ان دو تالیفات پر ہے جو اب بھی خواص و عوام میں معروف و مقبول ہیں اور جن کا ذکر ہم نے اب تک اس لیے نہیں کیا کہ اُن پر ذرا تفصیل سے نظر ڈالنا ضروری تھا۔ حیدری کی ان دو کتابوں میں سے ایک کا نام طوطا کہانی ہے اور دوسری کا آرائشِ محفل۔ دونوں کتابیں کہانی و داستان کی کتابیں ہیں اور دونوں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر تالیف ہوئیں۔

طوطا کہانی : طوطا کہانی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہانیوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں سب کہانیاں ایک طوطے کی زبانی بیان کی گئی ہیں۔ ایک عورت اپنے شوہر کی غیر حاضری میں اپنے عاشق سے ملنے جانا چاہتی ہے۔ طوطا ہر روز اُسے ایک نئی کہانی سُنا کر باتوں باتوں میں صبح کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح ۳۵ دن تک جاری رہتا ہے۔ اس دوران میں اس کا شوہر واپس آ جاتا ہے اور کہانیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔

طوطا کہانی کی اصل سنسکرت سے ہے۔ کہتے ہیں بارہویں صدی سے پہلے شاید چنتامُنی بھٹ نامی ایک شخص نے "شک سپ تتی" نام کی ایک کتاب لکھی اور ایک کہانی کو بنیاد بنا کر طوطے کی زبان سے ستر کہانیوں کا سلسلہ اس بنیادی یا مرکزی کہانی سے ملا دیا۔ ان کہانیوں میں عورتوں کی بے وفائی اَبد کرداری کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض کہانیاں خاصی فحش ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب "اُردو کی نثری داستانیں" میں اس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ طوطی نامہ اتنا

مشہور کس لیے ہوا۔ سنسکرت میں "شک سپ تتی" ایک پست کتاب سمجھی جاتی ہے اور بالکل گمنام ہے۔ اُن کے خیال میں اس کی شہرت کا باعث فارسی کے مؤلف و مترجم ضیا نخشبی کی شخصیت ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد اگر ہم پھر اس طرف رُخ کریں کہ سنسکرت کا قصہ کس طرح منزل بہ منزل اُردو تک پہنچا تو اس کی سب سے اہم کڑی یہ ہے کہ مولانا ضیاء الدین نخشبی بدایونی نے (وفات ۱۳۵۰ء/ ۷۵۱ھ) سنسکرت کی ان ستّر کہانیوں میں ۵۲ کہانیاں انتخاب کر کے اُنھیں (۱۳۳۰ء/ ۷۳۰ھ) میں فارسی کا لباس پہنایا اور اس کتاب کا نام طوطی نامہ رکھا۔ لیکن نخشبی کی عبارت پیچیدہ اور مشکل تھی اس لیے بعض دوسرے اہلِ قلم نے اسے اپنے اسلوب و انداز میں لکھا۔ ان میں سے ایک ابو الفضل کا لکھا ہوا ہے۔ ابو الفضل نے دسویں صدی ہجری میں اکبر کے حکم سے نخشبی کی ۵۲ حکایتوں کا خلاصہ لکھا۔ دوسرا سید محمد قادری کا طوطی نامہ ہے۔ اس میں نخشبی کی ۵۲ کہانیوں میں ۳۵ کہانیاں لے کر انہیں سلیس اور بامحاورہ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کا سنہ تالیف ۱۷۲۹ء/ ۱۱۴۲ھ ہے۔ قادری کے اسی طوطی نامہ کو حیدری نے اُردو میں منتقل کیا ہے[1]

[1] طوطی نامہ کی کہانیاں کتنی مقبول ہوئیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کہانیوں کو بہت سی مشرقی و مغربی زبانوں میں منتقل کیا گیا ہے۔ ان ترجموں کی تفصیل "اُردو کی نثری داستانیں" کے ایک ضمیمے میں شامل ہیں۔ اُس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سنسکرت: بارھویں صدی سے پہلے — غالباً از چنتامنی بھٹ
اس کے بعد — سوتیا برجین
مشرقی راجستھانی: دیودت کا سنسکرت سے ترجمہ
گجراتی: نظم اور نثر دونوں میں
ہندی: بھیروں پرشاد، لکھنؤ ۱۸۷۴ء (سنسکرت سے ترجمہ) دوسرا ترجمہ اُردو سے ۱۸۸۶ء
فارسی: طوطی نامہ نخشبی ۱۳۳۰ء۔ منتخب طوطی نامہ حمید لاہوری۔ حکایات نخشبی مکتوبہ ۱۰۸۲ء (کتب خانہ رامپور)۔ حکایات نخشبی کا خلاصہ از ابو الفضل۔ طوطی نامہ از سید محمد قادری ۱۷۲۹ء/ ۱۱۴۲ھ۔ ترجمہ طوطی نامہ قادر گلکسے ۱۰ کہانیاں (مکتوبہ ۱۸۰۲ء) سری انگ پٹم۔ طوطی نامہ نثر (آخر میں نظم شامل ہے) فہرست مخطوطات بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ۔
طوطی نامہ نثر از عباد اللہ مطبوعہ ۱۲۸۲ھ۔

کتاب کے مختصر دیباچے میں حیدری نے کتاب کے ترجمے کے سلسلے میں کئی اہم باتیں لکھی ہیں۔ دیباچے کا اقتباس درج ذیل ہے:

"سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہ جہان آبادی، تعلیم یافتہ مجلسِ خاص نواب ابراہیم خاں بہادر مرحوم شاگرد غلام حسین غازی پوری، دست گرفتہ صاحب عالی جناب سخندانِ آبرو بخش معدنِ مروت، چشمۂ فتوحات، دریائے جود و کرم، منبعِ علم و حلم صاحب الاشان جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی کا بھی رکھتا ہے لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ترکی: طوطی نامہ از شیخ عبداللہ صابری۔ بخشی سے آزاد ترجمہ۔

اُردو: ابوالفضل کے نسخے میں ابتدائی ۳۲ کہانیوں کا بین السطور دکنی ترجمہ (برٹش میوزیم) دکنی مثنوی از غواصی ۱۶۳۹ء/۱۰۴۹ھ بخشی کی ۳۵ کہانیوں کا آزاد ترجمہ۔ دکنی نظم از ابن نشاطی (۱۶۶۵ء/۱۰۷۶ھ) قادری سے دکنی ترجمہ مکتوبہ ۱۷۲۹ء/۱۱۴۲ھ (لائبریری جامعہ عثمانیہ) دکنی طوطا کہانی قادری سے ترجمہ ۱۲۲۰ھ کے قریب (ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد)؛ طوطا کہانی، حیدری (۱۸۰۱ء) حکایاتِ سخن سنج از انباپرشاد رسا (دلی ۱۸۴۵ء) قادری کا ترجمہ۔

انگریزی: ترجمہ بخشی از GERRONS (۱۷۹۲ء)؛ ترجمہ قادری از گلیڈون (۱۸۰۰ء کلکتہ)؛ ترجمہ قادری از JOHN HADDON (۱۸۰۹ء)؛ اردو ترجمہ از جارج اسمال (۱۸۷۵ء لندن)

جرمن: ترجمہ IKEN قادری کے طوطی نامے سے (۱۸۲۲ء)؛ ترجمہ جارج روسن (GEORGE ROSSEN) ترکی سے (۱۸۵۸ء لندن)

فرانسیسی: مُلر کا ترجمہ ۱۹۳۴ء

یونانی: THY PALDOROI GALONOS کا کیا ہوا ترجمہ شک سپ تتی (۱۸۵۱ء)۔

بنگالی: توتا اتہاس۔ چندن جبری (۱۸۰۹ء سیرام پور) حیدری کا ترجمہ۔

مرہٹی: نثر کا ترجمہ۔

کے ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۱ء کے، حکومت میں سر گروہِ امیرانِ جہان، حامیٔ غریبان و بے کسان، زبدۂ رئیسانِ عظیم الشان، مشیرِ خاص شاہ کیواں بارگاہِ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے، محمد قادری کے طوطی نامہ کا، جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی ہے، زبانِ ہندی میں موافق محاورۂ اُردوئے معلّیٰ کے عبارت سلیس و خوب، الفاظِ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور اس کا نام طوطی نامہ رکھا، تا صاحبِ نا آموزوں کی فہم میں جلد آوے۔"

حیدری نے اپنے ترجمے کے متعلق کہا ہے کہ وہ زبان ہندی میں موافق محاورۂ اردوئے معلّیٰ کے سلیس و خوب عبارت میں کیا گیا ہے اور اس میں رنگین و مرغوب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ طوطا کہانی کے ایک آدھ اقتباس سے اس کے طرز کی خصوصیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ طوطا کہانی کی چھٹی داستان اس طرح شروع ہوتی ہے:

"جب آفتاب چھپا اور ماہتاب نکلا خجستہ نے ایک جوڑا دھانی گلے میں ڈالا اور ہر ایک جواہر سے اپنے تئیں سنوارا اور مستی کی دھڑی کا لکھوٹا ہونٹوں پر جمایا۔ بالوں میں تیل ڈال، کنگھی کر، چوٹی گندھا ایک بانکپن سے اُٹھی اور طوطے کے پاس رخصت لینے گئی اور کہنے لگی اے طوطے! تو مجھے ہر ایک وقت باتوں میں لگا لیتا ہے اور یوں ہی جھوٹ موٹ بہلا دیتا ہے۔ تجھے میری خبر نہیں ہے کہ میں دردِ عشق سے مرتی ہوں اور حسبِ حال میرے یہ بند ہے۔ مخمس:

حیراں ہوں کیا کرے گا تراوعدہ اور پیام
اس مخمصے کے بیچ مرا کام ہے تمام
گر زندگی عزیز ہے میری تو صبح و شام
موقوف کر یہی ہے مرا حاصلِ کلام
طاقت نہیں رہی مجھے اب انتظار کی

اکتیسویں داستان کی ابتدا یہ ہے:

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ چاک گریبان و حال پریشان

آنکھوں میں آنسو بھرے سر کھلے طوطے کے پاس رخصت لینے گئی اور کہنے لگی: "اے یارِ وفادار، و اے محرمِ رازِ دل افگار، فرد ؎

آتشِ عشق سے جلے ہے دل
آہ یہ آگ کس نے بھڑکائی

اے طوطے! اب تو میرا دل اس کی جدائی سے جلا جاتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ جگر کباب ہو گیا۔ سچ جان میں آج کسی صورت اس گھر میں نہ رہوں گی اور اپنے جانی کے پاس خواہ مخواہ جاؤں گی۔ تو بھی جلد رخصت کر۔ طوطا اپنے جی میں ڈرا اور کہنے لگا کہ خدا حافظ، یقین ہے کہ یہ اب اس گھڑی کسی طرح نہ رُکے گی، کیونکہ نہایت بے قراری رکھتی ہے اور میری بات نہ سُنے گی، ازبسکہ مضطر ہے۔ یہ سوچ کر بہ ناچاری کہنے لگا کہ اے بانو! میں تجھے ہر شب رخصت کرتا ہوں اور خدا سے چاہتا ہوں کہ تو اپنے یارِ غمگسار سے ملے، تو آپ ہی توقف کرتی ہے جو نہیں جاتی، اور نہیں معلوم کہ نصیب تیرے کیسے ہیں جو برگشتہ رہتے ہیں۔ لے، بسم اللہ، دیر نہ کر، اپنے یار کو گلے لگا۔ پر یہ بات یاد رکھنا کہ کسی دشمن کا اعتبار نہ کرنا نہیں تو وہ صدمہ گزرے گا جو اس امیر زادے پر اُس سانپ کے سبب سے گزرا۔ خجستہ نے پوچھا کہ اُس کی حکایت کیونکر ہے بیان کر۔"

ان دو اقتباسات میں سے پہلے پر نظر ڈالنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ حیدری کسی واقعے کے بیان میں تکلف اور تصنّع سے کام نہیں لیتے بلکہ بات کو اسی طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ پیش آئی ہے۔ "جب آفتاب چھپا اور ماہتاب نکلا" کے ٹکڑے میں واقعہ نگاری کی بے لوث سادگی ہے۔ اس کے بعد خجستہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اُس میں بھی حقیقت کا سادہ رنگ غالب ہے۔ خجستہ کے بناؤ سنگار کا ذکر عین مطابق فطرت بھی ہے اور ایک خاص طرح کی معاشرت کی صحیح عکاسی بھی۔ خجستہ نے اپنے جذبات کا اظہار جس انداز سے کیا ہے اس میں بناوٹ کو دخل نہیں۔ آخر کے ٹکڑے میں محاورے اور شعریت کی ملی جلی

چاشنی ہے لیکن وہ بھی مبالغے سے خالی نہیں ہے۔

دوسرا اقتباس پہلے سے ذرا مختلف ہے اس میں خجستہ کا حالِ زار بیان کرنے میں قصہ گو نے چاک گریباں، حالِ پریشاں کے ٹکڑے لگا کر کسی قدر رسمی بنا دیا ہے۔ اسی طرح یارِ وفادار اور محرمِ رازِ دل افگار میں قافیہ پیمائی کی دانستہ کوشش ہے اور پھر اس کے بعد دل جلا جاتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے اور جگر کباب ہو گیا میں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محاورے دیدہ و دانستہ استعمال کیے گئے ہیں اور ان سب چیزوں کا مقصد عبارت میں تھوڑی سی رنگینی پیدا کرنا اور اُسے محاورے کی چاشنی سے مزے دار بنانا ہے اس لیے کہ ان چھوٹے چھوٹے تکلفات اور مصنوعی وسائل کے استعمال کے باوجود عبارت میں گرانی، پیچیدگی اور ثقالت پیدا نہیں ہوئی۔ اُس کی سلاست اور روانی اب بھی باقی ہے اور حیدری کا اصل مقصد یہی ہے۔ وہ اُردو کے محاورے اور روزمرہ سے اچھی طرح واقف ہیں، اُنھیں ان رسوم اور تکلفات کا بھی علم ہے جن سے عبارت میں رنگینی پیدا کی جاتی ہے اور وہ کہیں ان چیزوں سے کام بھی لیتے ہیں لیکن صرف اسی حد تک کہ عبارت کی مجموعی سادگی، بے تکلفی، سلاست اور روانی میں فرق نہ آنے پائے۔

حیدری نے اپنی عبارتوں میں جا بجا برمحل اشعار بھی استعمال کیے ہیں لیکن اُن کی بھرمار نہیں کی اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ اشعار اُن کی نثر کی طرح شُستہ اور عموماً اچھے مذاق کے ہیں۔

طوطا کہانی کی داستانوں میں جا بجا مسلمانوں کی معاشرت اور اُن کے رہن سہن کی جو جھلک ہے، اُس کی وجہ سے اُن میں ترجمے کی جگہ تالیف کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

لہ مزید مطالعے کے لیے رجوع کیجیے:
توطا کہانی حیدر بخش حیدری، مجلس ترقی ادب لاہور، اکتوبر ۱۹۶۳ء
مقدمہ، (۱) محمد اسمٰعیل پانی پتی، صفحہ ۱ - ۴۲
(۲) ڈاکٹر وحید قریشی، صفحہ ۴۳ - ۸۱
(مرتب)

آرائشِ محفل : حیدری کی دوسری معروف تالیف ان کی کتاب آرائشِ محفل ہے جو اپنی داستانی خصوصیات کی بنا پر طوطا کہانی کے مقابلے میں کہیں زیادہ پسندیدگی سے دیکھی گئی ہے اور فورٹ ولیم کالج کی داستانوں میں شہرت کے اعتبار سے کم و بیش وہی درجہ رکھتی ہے جو باغ و بہار کو حاصل ہے۔

آرائشِ محفل میں حاتم کی سات مہموں کو قصّے کے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ؛ — ناسخ نے "سخن شعرا" میں حیدری کی اس کتاب کا نام "ہفت سیرِ حاتم" لکھا ہے۔ ہفت سیرِ حاتم اصل میں فارسی میں تھی[۱] حیدری نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے سے اُسے اُردو کا لباس پہنایا اور جیسا کہ اُنھوں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے اس میں جابجا اضافے کیے ہیں۔ اس سلسلے میں حیدری کے الفاظ یہ ہیں ..... " زبانِ ریختہ میں اپنی طبع کے موافق اس کتاب سے جو ہاتھ لگی تھی ترجمہ نثر میں کیا اور اس کا نام آرائشِ محفل رکھا مگر اکثر اس میں اپنی طبیعت سے جہاں موقع پایا وہاں اور زیادہ کیا تاکہ قصہ طولانی ہو جائے، سُننے

[۱] قصہ حاتم طائی کے فارسی میں بہت سے ایڈیشن اور مخطوطے ملتے ہیں۔ ان سب نسخوں میں قصّے کا متن عموماً ایک سا ہوتا ہے۔ حیدری نے اسی طرح کے کسی قصّے کو اپنی تالیف کی بنیاد بنایا ہے۔ حیدری کے قصّے اور فارسی کے متن میں نمایاں فرق یہ ہے کہ فارسی کا قصہ بغیر کسی تمہید کے فوراً شروع ہو جاتا ہے۔ قصّے کے شروع یا آخر میں نہ مصنف کا نام ہوتا ہے اور نہ قصّے کی تالیف کی تاریخ۔ ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب "شمالی ہند کی نثری داستانیں" میں فارسی کے بعض نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے بیان کے مطابق اس کا سب سے پرانا نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ کتابت ۱۷۳۱ء/۱۱۴۴ھ اور مقام مرشد آباد درج ہے۔ بوڈلین لائبریری میں ایک نسخہ "قصص و آثارِ حاتم طائی" ہے۔ یہ ۱۴۸۶ء/۸۹۱ھ میں ملا حسین واعظ کاشفی نے تالیف کیا۔ اس میں حاتم طائی کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ حاتم طائی کے دوسرے فارسی مخطوطات کے مختلف نام ہیں۔ سیاحتِ حاتم، ہفت سیرِ حاتم اور قصّۂ حاتم طائی اور حسن بانو۔ انڈیا آفس لائبریری میں ایک فارسی مخطوطہ ہے جس کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں "ہفت سیرِ حاتم" ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

والے کو خوش آئے"

حیدری کے ان الفاظ سے دو باتیں ظاہر ہیں۔ ایک تو یہ کہ حیدری نے فارسی قصّے کا ترجمہ زبانِ ریختہ میں کیا ہے اور دوسرے اس میں اپنی پسند کے مطابق جہاں جہاں مناسب سمجھا ہے اس میں بعض اضافے کیے ہیں۔ آرائشِ محفل کے مطالعے کے بعد ان چیزوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ قصّہ اُسی طرز و اسلوب میں لکھا گیا ہے جو حیدری نے اپنی دوسری تالیفات میں اختیار کیا ہے، یعنی زبان میں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ سادگی، بے تکلفی، سلاست اور روانی ہے۔ اس میں جان بوجھ کر محاوروں کو کثرت کے ساتھ استعمال نہیں کیا گیا بلکہ جو محاورہ جس جگہ بغیر آورد کے اس طرح آ گیا کہ اس سے بات زیادہ مؤثر بن گئی اُسے بے تکلفی سے عبارت میں صرف کر لیا گیا۔ قواعد کی پابندی کو عموماً محاورہ کے پُر تکلف صرف پر ترجیح دی گئی ہے۔ اس سادگی اور سلاست کے باوجود جہاں کہیں ضرورت پیش آئی ہے وہاں عبارت کو مقفّیٰ و مسجّع بنا لیا گیا ہے۔ عبارت میں حُسن اور بات میں اثر پیدا کر لینے کے لیے شاعرانہ انداز اور مبالغہ آمیز عبارت آرائی سے بھی کام لیا گیا ہے؛

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور دوسرے میں ہفت انصاف حاتم" ملا فیروز لائبریری (ممبئی) میں ایک قلمی نسخہ ہے، جس کا نام "حاتم نامہ" ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں ۱۸۱۰ء میں منشی دیانت اللہ نے ایک فارسی ایڈیشن ترتیب دیا تھا۔ یہ ایڈیشن عام نسخوں سے مختصر ہے اس لیے کہ اس کے بعض حصّے حذف کر دیے گئے ہیں۔ ۱۸۲۴ء میں ڈنکن فاربس نے چار فارسی کے نسخے فراہم کر کے ۱۸۲۸ء ایک نسخہ انگریزی میں ترتیب دیا۔ فارسی کے چار نسخوں اور فاربس کے انگریزی نسخے کی مدد سے قاضی ابراہیم اور ملا نورالدین نے ایک فارسی کا نسخہ مرتب کیا اور اسے ۱۸۷۱ء/۱۲۸۸ھ میں ممبئی سے شائع کیا۔

فارسی اور اردو میں کئی شخصوں نے اس قصّے کو مثنوی کی شکل دی۔ یہ سب مثنویاں ۱۲۰۰ھ کے بعد کی ہیں۔ فارسی، اُردو، ہندی اور انگریزی کے بعض اور نسخوں کا حال "نثری داستانیں" کے صفحات ۵۶۴ و ۵۶۵ پر درج ہے۔

لیکن شاعرانہ بیان کو ایسا نہیں بنایا گیا کہ عبارت بوجھل یا پُرپیچ بن جائے۔ نہ مبالغے کو اس حد تک آزاد و بےباک چھوڑ دیا گیا ہے کہ ذہن اُسے قبول کرنے سے انکار کردے۔

حیدری کا اسلوب مجموعی حیثیت سے فطرت کے حدود میں رہا ہے اور اسی حد میں رہ کر واقعہ نگاری، کردار نگاری اور قصّہ گوئی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور سچ پوچھئے تو آرائشِ محفل میں یہ حق اس حد تک ادا ہوا ہے کہ اُس کی دلچسپی آخر تک اسی طرح قائم رہتی ہے جیسی داستان کے آغاز میں تھی۔

آرائشِ محفل میں وہ سب باتیں موجود ہیں جو اب داستان کے فن اور اُس کی روایت کا لازمی عنصر سمجھی جاتی ہیں۔ اس میں غیر فطری عناصر کی بھرمار ہے۔ جن دیو، پریاں، سحر، طلسمات اور عجیب الخلقت جانور قدم قدم پر ملتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے مافوق فطرت عمل صادر اور ظاہر ہوتے ہیں لیکن مافوق فطرت عمل کی اس طلسمی دُنیا میں تخلیق کی جدت اور تصور کی بوقلمونی اور رنگینی کے باوجود مبالغے کا رنگ ہلکا ہے۔

آرائشِ محفل کا ہیرو بھی داستانوں کے سورماؤں کی طرح غیر فطری صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کے کردار میں نیکی اُس حد تک پہنچ گئی ہے جسے یقیناً انسانیت کے بلند ترین تصوّر کے نزدیک بھی مثالی کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے ہر عمل میں، اُس کے اندازِ فکر میں اور اس کے ایمانِ محکم میں ایک ایسی بات ہے کہ اس کی شخصیت کبھی غیر فطری نہیں معلوم ہوتی بلکہ سچ پوچھیئے تو اپنی سب مہمّوں میں بھی حاتم ایسی کیفیتوں سے دوچار ہوتا دکھائی دیتا ہے جو صرف گوشت پوست کے ایک معمولی انسان کے لیے وقف ہوسکتی ہیں، خوف و ہراس، مایوسی و نااُمیدی، بے بسی و بےچارگی، بھوک اور تھکن — یہ چیزیں اُس پر بھی غلبہ پاتی ہیں لیکن اُس کا عزم، استقلال، جرأت، مردانگی اور توکل، تائیدِ غیبی، کسی غیر متوقع واقعے یا سانحے کا ظہور کسی فوق الفطرت قوت کا سہارا اس کے پائے ثبات کو اُس کے نصب العین کی جستجو سے غافل اور اپنی منزل کے سفر سے منحرف نہیں ہونے دیتا اور اس طرح داستان

عجیب سے عجیب اور دشوار سے دشوار مرحلوں تک پہنچ کر اُس مرکز پر لوٹ آتی ہے جس کا محور بہرحال فطرت اور صداقت کے حدود ہیں۔

داستانوں کی عام روایت کے مطابق آرائشِ محفل کی پوری ساخت اخلاقی نکات کے سہارے پر ہوئی ہے، اس کے ہر لفظ میں نیکی کی تلقین ہے، لیکن اپنی کثرت کے باوجود وہ تلخ و ناگوار اس لیے نہیں کہ یہ نیکی ہر لمحے معروفِ عمل ہے۔ آرائشِ محفل کے ہیرو کا ہر قدم نیکی کی طرف اُٹھتا ہے اور ہر تازہ مہم کو سر کرکے وہ نیکی کے مفہوم کو زیادہ واضح اور اس کی بنیادوں کو زیادہ مستحکم کرتا دکھائی دیتا ہے۔

آرائشِ محفل میں اُس رچے ہوئے معاشرتی اور تہذیبی مذاق کی یقیناً کمی ہے جس میں باغ و بہار، پوری طرح ڈوبی ہوئی ہے، لیکن اس میں ایک بات یقیناً باغ و بہار سے بہتر ہے اور وہ یہ کہ اُس میں کہانی پن کی کمی نہیں اور نہ اس میں کسی جگہ اُس ذہنی تھکن کے آثار ہیں جو باغ و بہار کا مطالعہ کرنے والے کو اس کے اجزا میں محسوس ہوتی ہے۔ آرائشِ محفل داستان سرائی اور قصّہ گوئی کی سادہ اور بےلوث روایت کی صحیح ترجمان ہے۔[1]

---

[1] آرائشِ محفل پر ناقدین نے بہت کم توجہ دی ہے تاہم جن تین کتابوں میں اس کے مآخذ اور بعض ادبی ادبی اور فنی پہلوؤں پر تھوڑی بہت بحث کی گئی ہے وہ یہ ہیں:

(i) شمالی ہند کی اُردو نثری داستانیں ـ ڈاکٹر گیان چند۔ کتاب کے مختلف ابواب میں علیحدہ عنوانات کے تحت اس کی اصل اور اس کے ادبی پہلوؤں پر بڑا دلچسپ اور کارآمد تبصرہ ہے۔

(ii) فنِ داستان گوئی ـ کلیم الدین احمد۔ اُردو کی مختصر داستانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آرائشِ محفل پر بھی اختصار کے ساتھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

(iii) ہماری داستانیں ـ وقار عظیم۔ کتاب کے ایک باب میں حاتم کی مہموں کا تجزیہ کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مہمیں فطرت اور صداقت کے معیار پر کس حد تک پوری اُترتی ہیں (مولف)

"آرائشِ محفل" ڈاکٹر محمد اسلم قریشی کی تدوین اور مقدمے کے ساتھ، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور سے جولائی ۱۹۶۳ء میں چھپی۔ یہ متن اور مقدمہ بھی قابلِ ذکر ہے۔

نیز دیکھیے: آرائشِ محفل، مرتبہ: اطہر پرویز، مکتبہ جامعہ، دہلی ۱۹۷۲ء۔ (مرتب)

میر شیر علی افسوس :

میر شیر علی افسوس[۱] کے آبا و اجداد قاف کے رہنے والے تھے اور اُن کا سلسلہ حضرت امام جعفر صادق ؑ سے ملتا ہے۔ ان کے خاندان کے ایک بزرگ (جدِّ اعلیٰ) سید بدر الدین اور ان کے بھائی سید علم الدین حاجی خانی اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے تھے اور قصبہ نارنول (صوبۂ آگرہ) کو اپنا وطن بنایا تھا۔ ان کے دادا سید غلام مصطفیٰ خاں محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں (۱۷۱۹ء/۱۱۳۱ھ تا ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ) دہلی آگئے۔ اس وقت اُن کے دونوں بیٹے سید مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں اُن کے ساتھ تھے۔ تینوں دہلی آکر عمدۃ الملک نواب امیر خاں کے حلقۂ ملازمت میں شامل ہو گئے۔ ۱۷۴۶ء/۱۱۵۹ھ میں نواب عمدۃ الملک کا انتقال ہوا تو افسوس کے چچا سید غلام علی خاں اُن کی جگہ الہ آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔ دو سال بعد محمد شاہی عہد کے خاتمے کے ساتھ نظام سلطنت میں ابتری پیدا ہو گئی۔ انھیں دنوں سید غلام علی کا بھی انتقال ہو گیا اس لیے افسوس کے والد سید مظفر علی خاں پٹنہ چلے گئے اور نواب

[۱] میر شیر علی افسوس کے حالات زندگی ان کی کتابوں کے دیباچوں اور مرزا علی لطف کے تذکرۂ "گلشن ہند" سے (بہ حوالہ اربابِ نثرِ اردو و داستانِ تاریخِ اردو) سے ماخوذ ہیں۔

بنگالہ میر قاسم کے داروغۂ توپ خانہ ہو گئے اور میر قاسم کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے میر جعفر کے ملازم رہے۔ ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کی معزولی پر وہاں سے لکھنؤ آئے اور تین سو مہینے پر نواب شجاع الدولہ کے ملازم ہو گئے۔ یہاں تین چار سال رہ کر حیدر آباد چلے گئے، وہیں انتقال کیا۔

افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی صحیح تاریخ پیدائش کسی نے نہیں لکھی۔ لیکن افسوس نے ایک جگہ خود لکھا ہے کہ نواب عمدۃ الملک کی وفات کے تین چار سال بعد جب اُن کے والد تلاشِ معاش میں گھر سے نکلے تو ان کی (یعنی افسوس کی) عمر گیارہ سال تھی۔" اس بیان کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے افسوس ۱۷۳۷ء یا ۱۷۳۸ء میں پیدا ہوئے ہوں گے[۱]۔ افسوس بنگال میں اپنے والد کے ساتھ تھے۔ شعر و شاعری کا شوق اسی وقت سے تھا۔ اس سلسلے میں افسوس نے خود لکھا ہے :

"سیرِ دیوانِ ولی کی اکثر کرتا تھا۔ طبیعت موزوں ان ایام میں بھی تھی چنانچہ کئی شعر اوقاتِ مذکورہ میں بہ وضعِ قدما کہے تھے۔ یہ مطلع انھیں میں سے ہے۔ بیت :

اے پیارے ترے اس حسنِ رنگیں کا خدا حافظ
تری اس زلفِ پُر چیں کا محمد مصطفیٰؐ حافظ

افسوس اپنے والد کے لکھنؤ پہنچنے سے دو سال پہلے ہی لکھنؤ پہنچ گئے تھے اور وہاں نواب شجاع الدولہ کے بھتیجے نواب سالار جنگ کے ملازم تھے اور اُن کے بیٹے میر نوازش علی خاں (سرفراز جنگ) کی اتالیقی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ چنانچہ جب نواب سالار جنگ کا انتقال ہو گیا تو نواب سرفراز جنگ اُن کی سرپرستی فرماتے رہے۔ افسوس اپنا دیوان نواب سالار جنگ کی حیات ہی میں مرتب کر چکے تھے۔ یہی زمانہ تھا جب شہزادہ جہاں بخت جہاندار شاہ (ولی عہد سلطنت مغلیہ) لکھنؤ میں مقیم تھے، انھوں نے افسوس کا کلام سُنا تو پسند فرمالیا اور افسوس کو اپنے حلقۂ شعرا میں داخل کر لیا۔ یہ زمانہ افسوس کے لیے اطمینان و فراغت کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے انھیں عربی کی متداول

[۱] کلب علی خاں فائق (مقدمہ آرائش محفل، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء) سالِ ولادت ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ قرار دیتے ہیں۔ [مرتب]

کتابوں پر عبور حاصل کیا۔

لکھنؤ کا یہ زمانہ شعر و شاعری کی تاریخ کا بڑا اہم زمانہ تھا۔ ہر طرف میر، سودا، جرأت اور انشا کی شاعری کا چرچا تھا۔ لکھنؤ کی بزم سخن ان اساتذہ کے دل نشین نغموں سے گونج رہی تھی۔ اس فضا میں افسوس کو بھی اپنے فطری ذوق کو ترقی اور جلا دینے کا موقع ملا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھتے اور داد و تحسین حاصل کرتے۔

جب شہزادہ جواں بخت دہلی جانے لگے تو افسوس کو بھی ساتھ لے جانا چاہا، لیکن انھوں نے لکھنؤ چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ افسوس کو اس کے بعد نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کے نائب سرفراز الدولہ[1] حسن رضا خاں نے اپنا مصاحب بنا لیا۔ قیام لکھنؤ کے آخری زمانے میں افسوس نے شعر و شاعری ترک کر کے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا۔ اسی زمانے میں گلکرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کے لیے اہل قلم لوگوں کی خدمات کی ضرورت پیش آئی تو لکھنؤ کے رزیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے اُن کی سفارش کر کے اُنھیں کلکتہ بھیج دیا۔ وہ ۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ میں کلکتہ پہنچے اور ڈاکٹر گلکرسٹ نے اُنھیں دو سو روپے کے مشاہرہ پر ملازم رکھ لیا۔ ۱۸۰۹ء میں وہیں انتقال ہوا۔[2]

فورٹ ولیم کالج کے دوران قیام میں افسوس نے دو کتابیں ترتیب دیں، ایک

[1] یہ وہی سرفراز الدولہ ہیں جن کی شان میں سودا نے دو قصیدے کہے ہیں اور وہ ان کے کلیات میں شامل ہیں۔ دونوں قصیدوں کے مطلعے یہ ہیں:

(۱) صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام — حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام

(۲) عزیز عقل کو سودا کی تھی جدائی شاق — سو اس کنے وہ پھر آیا ہے بس کہ تھا مشتاق

[2] بیل کی کتاب 'BIOGRAPHICAL DICTIONARY' میں اُن کی تاریخ وفات ۱۸۰۹ء لکھی ہے۔ وناسی اور بعض اور تذکروں کے بیان کے مطابق یہ تاریخ ۱۸۰۹ء ہے۔

(مولف)

ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے لکشمی ساگر اور وارشنے کی ہندی تالیف "فورٹ ولیم کالج" کے صفحہ ۱۰۳ کے حوالے سے افسوس کی تاریخ وفات ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء بتائی ہے۔ دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۱۵ اور صفحہ ۱۴۸

(مرتب)

باغ اُردو اور دوسری آرائش محفل۔

باغِ اُردو : باغ اُردو سعدی کی معروف تصنیف گلستاں کا ترجمہ ہے۔[1] اس کے دیباچے میں افسوس نے فورٹ ولیم کالج سے اپنے تعلق اور کتاب کے ترجمے کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

"...... لیکن میرا تعلق جو مدرسۂ ہندی (یعنی فورٹ ولیم کالج) سے ہوا۔ بنا بر اس کے بسا اوقات خدمت میں صاحب عالی طبیعت، والا فطنت، مدرس ہندی، مسٹر جان گلکرسٹ صاحب دام ثروتہٗ کے، کہ جامع قوانین اس زبان کے ہیں، حاضر ہونے لگا۔ ایک دن صاحب موصوف نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستانِ سعدی شیرازی کا زبان اُردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بظاہر صاف و بباطن پیچ دار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور ابتدا میں قوت تالیف اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی۔ مصرعہ

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

ارادہ کیا اس سے پہلو تہی اور سر عجز آگے دھروں۔ پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیۂ خیال میں اُن کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا۔ تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو، اُسے

[1] شیر علی افسوس کی "باغ اُردو" کو گلکرسٹ نے ۱۸۰۲ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع کیا اور بقول عتیق صدیقی "یہی اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔" (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع اول ص ۲۷۳، طبع دوم ص ۲۷۶) لیکن جرمن مستشرق بنجمن شولٹس کی تالیف "مختصر اصول سیمی" (مطبوعہ ہالے، جرمنی ۱۷۴۳ء) کی موجودگی میں جو باغ اردو سے نصف صدی سے بھی پہلے کی چھپی ہوئی ہے، "باغ اردو" کو اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب کہنا درست نہیں۔ تفصیل کے لیے رجوع کیجیے "مقالہ: اُردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" از: س۔ م۔ شاہ، مشمولہ اُردو نامہ، کراچی، اپریل جون ۱۹۷۰ء ص ۵ - ۱۶ (مرتب)

ترجمہ کروں۔ اگر بخوبی انجام ہوئی اور اہلِ معنی کو پسند پڑی فبہا ورنہ صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔ چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور علماؑ و عقلاؑ و شعرا، کہ یہاں تھے ان کو پسند پڑا۔ تب اس ضعیف نے کمر ہمت بقوت باندھی اور سعی بلیغ کی —— بارے فضلِ ایزدی اور لطفِ سرمدی سے تمام کتاب زبانِ اردو میں لکھی اور وہ مقبولِ خاص و عام ہوئی۔ نام اس کا باغ اُردو رکھا، چنانچہ اس کی شروع کی تاریخ بھی اسی میں نکلتی ہے۔ قطعہ :

کھول دل کھول با آئین نکو	میں تاریخ اس کی جو چاہا مع نام
کہ ہے آغاز اُردی باغ اردو	کہ اس میں ہاتفِ غیبی یہ بولا

۱   ۱۲۱۴ = ۱۲۱۵ھ

کتاب کے خاتمے پر لکھا ہے :

سن ہجری بارہ سے سولہ (۱۲۱۶ھ) اور عیسوی اٹھارہ سے دو (۱۸۰۲ء) میں ترجمہ کہ مسمّیٰ بہ باغ اُردو ہے تمام ہوا : قطعہ

عونِ توفیقِ ربِ سبحاں سے	ترجمہ یہ کیا تمام میں جب
ختم کی اس کے بیرِ عقل سے کی	میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدائے بہار سے یہ کہا	باغ اُردو ہوئی گلستاں اب[1]

۲   ۱۷۹۹ء = ۱۸۰۱ء

باغِ اُردو کو افسوس نے کئی حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّے کا عنوان ہے "ماحوالِ رسم خط" اس عنوان کے تحت ڈاکٹر گلکرسٹ کے رسالۂ رسم الخط و اعراب کا خلاصہ لکھا گیا ہے۔ دوسرے حصّے کا عنوان ذرا طویل ہے یہ دیباچہ ہے "تعریف میں لارڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے عذروں میں کتاب کے"۔ اس عنوان کے تحت لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہند کی تعریف کی گئی ہے۔ پھر مترجم نے اپنے مختصر حالات لکھ کر ترجمے کی مشکلات کا ذکر کیا ہے اور اپنی بے بضاعتی کا عذر پیش کیا ہے۔ ان دو ابتدائی

[1] مولوی عبدالحق اور صاحب سیر المصنفین نے باغ اُردو کی تاریخ تالیف ۱۸۰۰ء لکھی ہے حالانکہ ان دو قطعات کی موجودگی میں کسی طرح کی غلط فہمی یا اختلاف کی گنجائش نہیں۔

حصّوں کے بعد فارسی اصل کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ ختم کر چکنے کے بعد مترجم نے کتاب کے آخر پر کئی ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ ایک باب میں جس کا عنوان ہے "چند سطور بعضے عذروں میں اور فائدوں میں"۔ ترجمے کے طریقے پر بحث کی گئی ہے۔ اس سے اگلے باب میں شیخ سعدی کے اور حضرت امیر خسرو کے حالات درج ہیں۔ خاتمۂ کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اُردو میں تصنیف و تالیف کے کام کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور اس ضمن میں بتایا گیا ہے کہ مولف و مصنف کے لیے بھاکا، فارسی، عربی اور کسی قدر سنسکرت اور ترکی کی واقفیت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کے کلام کے مطالعے کی اہمیت بھی جتائی گئی ہے۔

عام طور پر میر شیر علی افسوس کے ترجمے کو "نہایت عمدہ اور بے نظیر" کہا گیا ہے اور اُسے "ان کے زمانے کی اردو کا نہایت اچھا نمونہ" بتایا گیا ہے[1]۔ لیکن باغ اُردو کا مطالعہ کیا جائے تو ان خیالات کی تائید نہیں ہوتی۔ افسوس نے دیباچے اور ترجمے میں جو زبان استعمال کی ہے اول تو اس میں اسلوب کے اعتبار سے یکسانی نہیں دوسرے ترجمے میں جو اُردو استعمال کی گئی ہے وہ سلیس اور با محاورہ نہیں بلکہ اکثر اوقات فارسی کا لفظی ترجمہ ہے۔

پہلے دیباچے کے وہ الفاظ دیکھیے جس میں حمد و نعت کی گئی ہے :

"تازگی گلستان سخن کی، حمد باغبانِ حقیقی کی ہے کہ اس نے بوستانِ عالم کو طرح طرح کے درختوں سے آرائش دی اور رنگ برنگ کے پھولوں سے زینت بخشی اور اس کے ابرِ رحمت کی بارش سے ہر ایک گل تر و تازہ، نسیمِ فیض سے اس کے ہر ایک درخت ہرا بھرا، ہر گل کی زبان وا ہے اس کے ذکر میں، جو غنچہ سر بجیب ہے اسی کے فکر میں۔ قمری اس کے طوقِ بندگی میں اسیر، تدرو اسی کے بندِ عشق سے پابہ زنجیر ...."

یہ عبارت رنگین اور مقفیٰ و مسجع ہے۔ اس کے بعد اس دیباچے کی زبان جس میں افسوس نے گورنر جنرل

[1] یہ رائے صاحب ارباب نثر اردو کی ہے۔

کی مدح کے بعد اپنا حال لکھا ہے سادہ اور سلیس ہے لیکن یہ سادگی بھی میر امن اور حیدری کی سی سادگی نہیں۔ اس میں عربی فارسی کے الفاظ بھی نسبتاً زیادہ ہیں۔ اضافتوں اور بندشوں میں بھی امن اور حیدری کی سی سادگی اور روانی نہیں۔

سلاست، سادگی اور روانی کی یہ کمی کتاب کے ترجمے میں اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ افسوسؔ نے عام طور پر ترجمہ لفظی کیا ہے۔ فارسی کے محاورے اور اسلوب کا موزوں اُردو بدل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سعدی نے اپنے مخصوص اندازِ فکر کی مطابقت سے جو ترکیبیں وضع کی ہیں اور جس طرح کا تخیل استعمال کیا ہے افسوسؔ نے اس میں تبدیلی کرنے کے بجائے اکثر اُسے اُسی طرح رہنے دیا ہے۔ ترجمے کی دوسری خرابی یہ ہے کہ افسوسؔ نے بعض اوقات فارسی کی مشکل ترکیبوں اور لفظوں کو اُردو کے آسان لفظوں سے بدلنے کے بجائے ویسا کا ویسا ہی رہنے دیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ترجمے میں بہت سے موقعے ایسے آتے ہیں جہاں عبارت مجموعی حیثیت سے ناہموار نظر آتی ہے۔ فارسی کے مشکل اور اُردو کے آسان لفظ باہم اجنبی اور بے میل معلوم ہوتے ہیں۔ اس ترجمے کی ایک اور خامی یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی ترتیب عموماً فارسی قواعد کے مطابق ہے اور اس لیے عبارت میں نہ سلاست پیدا ہوتی ہے نہ روانی اور بے تکلفی۔ ان سب خرابیوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ 'باغ اُردو' کا اسلوب بول چال اور روزمرّہ کا وہ اسلوب نہیں رہا جو فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کا عموماً اور میر امنؔ، حیدری اور حسینی کے ترجموں کا خصوصاً امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

'باغ اُردو' چونکہ عام طور سے دستیاب نہیں[۱] اس لیے اس کے دو تین اقتباس درج ذیل ہیں۔ ان اقتباسات سے 'باغ اُردو' اور شیر علی افسوسؔ کے اسلوب کا

---

[۱] یہ نایاب کتاب اب دستیاب ہے، دیکھیے:

'باغ اردو'، شیر علی افسوسؔ، مجلس ترقی ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء

حرف آغاز: سید امتیاز علی تاج، مقدمہ (حالاتِ زندگی): کلب علی خاں فائق، ص ۵-۱۲۰

[مرتب]

اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی:

"..... یہ ہیچ مدان نہیں کہتا کہ کلام میں میرے غلطی نہیں ہے یا کوئی اس کتاب کے مطالب ریختے کی زبان میں بیان نہ کر سکے گا، لاکن اتنا البتہ ہے کہ یہ خالی لطائف سے نہیں ہے اور جو کوئی اس پر ایسا ارادہ کرے گا تو قدر اس بے مقدار کی جانے گا۔ اب اُمید اہلِ نظر سے یہ ہے کہ اگر کہیں کہیں قبائح اس میں دیکھیں تو ان کو دامنِ کرم سے چھپا دیں اور زبان پر نہ لاویں کہ انسان کا کلام ممکن نہیں جو بے عیب ہو خصوص مجھ سے ناقص کا کہ اپنے کمال کو بھی نقصان جانتا ہوں اور جس کا سخن معقول ہو، مانتا ہوں۔ غرض دشمنوں کی آنکھوں میں یہ خار ہے اور دوستوں کی نظر میں گلزار۔"

☆

ایک شخص نوشیرواں کے پاس یہ خوشی کی یہ خبر لایا کہ تیرے فلانے دشمن کو حق تعالےٰ نے فانی کیا۔ فرمایا اس نے "یہ بھی سُنا ہے تو نے کہ میری حیات کو جاودانی کیا۔"

☆

حاصلِ کلام یہ ہے کہ انواعِ عقوبت میں گرفتار تھا اور سر کو میرے زانوئے غم سے سروکار تھا کہ اس ہفتے میں حاجیوں کے آنے کا مژدہ پہنچا۔ بارے اس قیدِ شدید سے مجھ کو رہا کیا اور ملک قدیم ہی میری یعنی قناعت مجھ پر معین کی۔ کہا میں نے کہ اس وقت میری نصیحت نہ مانی تو نے۔ چنانچہ میں کہتا تھا کہ عمل بادشاہوں کا مانند سفرِ دریا کی ہے، فائدہ مند اور خوف ناک یا گنج پائے گا تو یا رنج میں مر جائے گا۔"

★

آرائشِ محفل: افسوس کی دوسری کتاب "آرائشِ محفل"[1] "خلاصۃ التواریخ" کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب منشی سبحان رائے ساکن پٹیالہ نے ۱۶۹۵ء/ ۱۱۰۷ھ میں لکھی تھی یہ کتاب ہندوؤں اور مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان کی تاریخ ہے۔ مولف نے ان دونوں عہدوں کی سب مستند تاریخوں کے مطالعہ کے بعد یہ کتاب مرتب کی تھی اور ان کتابوں کا خلاصہ اپنی تالیف میں کر دیا تھا۔ اسی لیے اس کا نام خلاصۃ التواریخ رکھا تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے فورٹ ولیم سے چلے جانے کے بعد، ایچ مارنگٹن کی فرمائش پر افسوس نے ۱۸۰۴ء/ ۱۲۱۹ھ میں اس کا ترجمہ شروع کیا اور ۱۸۰۵ء/ ۱۲۲۰ھ میں عہدِ ہنود والا حصہ مکمل کر کے اس کا نام آرائشِ محفل رکھا۔ یہ کتاب ۱۸۰۸ء میں چھپی اور اردو دانی کے اعلیٰ امتحان کے نصاب میں داخل کی گئی۔ اس ایڈیشن کے بعد کلکتہ، لکھنؤ اور لاہور کے مختلف چھاپے خانوں سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ میجر ہنری کورٹ نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ۱۸۷۱ء میں الٰہ آباد سے اور پھر ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے اس کے دو ایڈیشن شائع کیے۔ جان شیکسپیئر نے اس کے دس بابوں کا ترجمہ کر کے منتخباتِ ہندی میں شامل کیا اور ۱۸۴۷ء میں ڈبلن سے شائع کیا۔

آرائشِ محفل کی عبارت میں سلاست روانی اور بے تکلفی کی وہ کمی نہیں جو باغ و بہار کے اکثر حصوں میں محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی عبارت مقفیٰ ہے اور میر امن اور حیدری کی با محاورہ اور عام فہم نثر کے مقابلے میں پُرتکلف اور کہیں کہیں مُغلق ہے۔ اس میں فارسی اور عربی الفاظ اور ترکیبوں کی کثرت ہے۔ اس کے باوجود مجموعی حیثیت سے عبارت میں روانی ہے۔ کتاب کا مجموعی اسلوب ادبی اور شاعرانہ ہے اور بعض اوقات تاریخ گوئی کی سنجیدگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

---

[1] "آرائشِ محفل" کی ایک اشاعت: مرتبہ: کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء
مقدمہ: حیاتِ افسوس، از: کلب علی خاں فائق، ص ۱-۴۱
انتقاد، از: سید عابد علی عابد، ص ۴۲-۸۳
(مرتب)

"جب سے یہ مرکزِ خاکی آرام گاہِ حیوانات ہوا، سیکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں۔ کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ، لیکن ہندوستان کی سرزمین کا عالم سب سے نرالا ہے۔ کوئی ولایت اس کی وسعت کو نہیں پہنچتی اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی۔ یہاں کی ہر ایک بستی میں گھما گھم، جا بجا ایک نئی طرح کا عالم۔ ہر شہر و قصبہ میں ستھری، پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں، مسافر کے واسطے ہر قسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں۔ اکثر بیسیوں مسجدیں خانقاہیں مدرسے، باغات، غریبوں بے کسوں مسافروں کے لیے متعدد مکانات قلعے بڑے بڑے مضبوط، وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بسیں اور رفعت میں اس قدر کہ بادل اُن کے نیچے برسیں۔ ندی نالے تالاب کنویں لطیف و پاکیزہ ہزارہا، پانی اُن میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا۔ بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں، نواڑے، بجرے وغیرہ بے شمار، شاہراہ کے ندی نالوں پہ بیشتر مقاموں پر پُل بندھے ہوئے تیار۔ اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار۔ ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک مینار نمودار۔ ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا، سودے والوں کی دکانیں جا بجا۔ مسافر خوش و خرم کھاتے پیتے اُٹھتے بیٹھتے چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پہ بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں ؎

جہاں دیکھیے خیمہ ہی خیر ہے
سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے

سوا اس کے راہ میں اگر سونا اُچھالتے چلے جائیں کہیں خطرہ نہیں اور جنگل میں جہاں چاہیں سو رہیں کچھ پروا نہیں۔ چنانچہ ہمیشہ سوداگر بنجارے مال و متاع غلہ دور دور سے بھر لاتے ہیں اور

منزلِ مقصود پر سلامت جوں کا توں پہنچ جاتے ہیں۔[۱]

(آرائشِ محفل صفحہ ۲)

افسوسؔ نے ان دو کتابوں کے علاوہ بھی بعض کام کیے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے لیے افسوسؔ نے سوداؔ کے دیوان کا انتخاب کیا اور اس کے علاوہ میر بہادر علی حسینی کی تالیف 'نثرِ بے نظیر' پر نظرِ ثانی کی اور نہال چند لاہوری کی کتاب 'مذہبِ عشق' کی تصحیح کی۔ فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہونے سے پہلے وہ اپنا دیوان مرتب کر چکے تھے۔

مشہور تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر اپنے تذکروں میں کیا ہے۔[۲]

دیوان میں قصائد، مرثیے، سلام، غزلیں، مخمس، رباعیاں، 'ترکیب بند' واسوخت اور قطعات شامل ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد غزلوں اور اس کے بعد قصیدوں کی ہے۔[۳]

---

[۱] منقول از اربابِ نثرِ اردو صفحات ۱۰۸ و ۱۰۹۔

[۲] ناسخ کے سخن شعرا، علی ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزارِ ابراہیم، مصحفی کے تذکرہ ہندی اور تلطف کے گلشنِ ہند اور شیفتہ کے گلشنِ بے خار میں ان کے مختصر حالات اور نمونہ کلام درج ہے۔

[۳] میر شیر علی افسوسؔ کے سلسلے میں مزید مطالعہ کے لیے رجوع کیجیے:

(i) کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور ۱۹۶۵ء، صفحہ ۹۳ - ۱۶۲۔

(ii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۵، ۴۸۸ - ۴۹۳، ۵۳۸ - ۵۴۶ اور صفحہ ۵۸۷ - ۵۹۰۔

(iii) تحقیقی نوادر، ڈاکٹر اکبر حیدر کاشمیری، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء، ص ۲۴۱ - ۲۷۳

(iv) کلیاتِ افسوس، مرتبہ: ڈاکٹر سید ظہیر احسن، ادارہ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ۔ [مرتب]

میر بہادر علی حسینی :

میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے وسیلے سے میر امنؔ کی رسائی ڈاکٹر گلکرسٹ تک ہوئی تھی اور جن کا ذکر میر امنؔ نے باغ و بہار کے دیباچے میں "میر بہادر علی جی" کہہ کر کیا ہے۔ اُن کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ جو تھوڑی بہت باتیں اُن کی زندگی کے متعلق معلوم ہیں اُن کا ماخذ یا تو اُن کی تالیفات ہیں یا بعض متفرق ذرائع جن میں تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند" بھی شامل ہے۔[۱]

حسینی کے والد کا نام سیّد عبداللہ کاظم ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے اہتمام سے شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی کا ترجمہ قرآن مجید دہلی سے شائع ہوا تھا۔ ان کے والد کے متعلق یقین کے ساتھ یہ معلوم نہیں کہ ان کا وطن دہلی تھا یا نہیں لیکن بعض

---

[۱] میر بہادر علی حسینی کے بارے میں بعض نئے قابلِ ذکر ماخذ یہ ہیں:

(i) کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۸۹ - ۲۲۰

(ii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

ص ۱۰۷ - ۱۰۹، ۴۰۶ - ۴۱۰، ۴۱۶ - ۴۲۱، ۴۳۳ - ۴۳۹، ۴۷۸ - ۴۸۳ اور صفحہ ۵۴۶ تا ۵۵۱ (مرتب)

قیاسات کی بنا پر یہ بات یقینی ہے کہ وہ عرصے تک دہلی میں مقیم تھے۔ حسینی کے متعلق یہ بات بھی یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ اُنھوں نے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کب شروع کی اور اس کا سلسلہ کب تک جاری رہا۔ میرامّن کے اس بیان کی بنا پر جس میں اُنھوں نے حسینی کے توسّل سے جان گلکرسٹ تک رسائی کا ذکر کیا ہے، یہ بات یقینی ہے کہ وہ میرامّن سے پہلے کالج سے منسلک ہوئے تھے۔

طبقات الشعرا میں اُنھیں "ذی قدر شاعر" کہا گیا ہے اور تخلص حسینی بتایا گیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ کچھ اور لکھا ہے اور نہ کلام کا نمونہ دیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ شاعری سے ان کا تعلق محض رسمی اور تہذیبی تھا۔ شاعری محض اس لیے کرتے تھے کہ یہ چیز اُس زمانے کی تہذیبی اور مجلسی زندگی کا ایک ضروری عنصر سمجھی جاتی تھی۔ 'اخلاق ہندی' میں جا بجا جو شعر نثر کے ساتھ ملتے ہیں وہ غالباً اُنھیں کے ہیں۔ اگر ان شعروں کو معیار بنایا جائے تو وہ کچھ اچھے شاعر نہیں تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام میں حسینی نے چار کتابیں تالیف کیں: (۱) نثرِ بے نظیر (۲) اخلاقِ ہندی (۳) تاریخِ آسام اور (۴) رسالہ گل کرسٹ۔ اس کے علاوہ وہ حکایاتِ لقمان اور قرآن مجید کے ترجمے میں بھی شریک رہے تھے۔[۱]

نثرِ بے نظیر : نثرِ بے نظیر میں میرحسن کی شہرۂ آفاق مثنوی کی کہانی نثر میں بیان کی گئی ہے۔ کتاب کا سببِ تالیف حسینی نے اس طرح بیان کیا ہے :

"قصہ بے نظیر و بدرِ منیر کہ نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعرِ بے ہمتا، اوستادِ یکتا، رونقِ بزمِ سخن، میرحسن مرحوم المتخلص بہ حسنؔ، سعیدازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحکؔ دہلوی کا تھا۔ فی الواقع ہر ایک مصرع اُس کا فصاحت و بلاغت میں بے نظیر اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدرِ منیر۔ جو سخندانِ منصف مزاج، عاشق پیشہ ہیں، وہی اس کا طرز بخوبی پہچانتے ہیں۔ مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے۔ بلکہ کوئی رمز واں گویا تو سکے۔ قاصر ہے زبان اُس کی توصیف میں، ہر کہ و مہ مشغول ہے

---

[۱] نقلیات بھی حسینی سے منسوب ہے۔ دیکھیے زیرِ نظر کتاب کا حصّہ "اضافات" [مرتب]

اس کی تعریف میں۔ اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ کے، ۱۲۱۷ھ مطابق ۱۸۰۲ء کے، حکم سے صاحب خداوند نعمت، جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام حشمتہٗ کے، عاصی میر بہادر علی حسینی نے شروع قصہ سے، موافق محاورۂ خاص کے' نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرزِ سہل واسطے صاحبانِ نوآموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستانِ شیریں کو (کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے) اس رویّہ سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان داں و شاعر اس کو سُن کر عش عش کرے اور اس ہیچ مداں کی ایک یادگاری اس دنیا میں رہے۔"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ حسینی نے مثنوی کو دو مرتبہ نثر کا لباس پہنایا۔ پہلی مرتبہ نوآموز انگریزوں کے لیے بول چال کی سہل زبان میں اور دوسری مرتبہ اُسے زیادہ ادبی رنگ دے کر۔ دوسرے متن میں ادبی لطف پیدا کرنے کے لیے حسینی نثر کے بیچ بیچ میں مثنوی کے اشعار بھی چپاں کرتے گئے ہیں۔ یہ کتاب کالج کے نصاب میں شامل تھی اس لیے ۱۸۰۳ء میں خاصے اہتمام سے مثنوی کے متن کے ساتھ چھاپی گئی۔ دوسرا ایڈیشن مرتّب ہوتے وقت شیر علی افسوسؔ نے اس پر نظرِ ثانی کی اور اس کے بعد کتاب کے بہت سے ایڈیشن ہندوستان کے مختلف چھاپہ خانوں سے چھپے اور مقبول ہوئے۔ ۱۸۷۱ء میں ایچ۔ ایم کورٹ نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔

کتاب اب تقریباً نایاب ہے۔[۱] صاحب اربابِ نثرِ اردو نے سعی و کاوش

---

[۱] 'نثرِ بے نظیر' کا نستعلیق ٹائپ میں ایک اچھا ایڈیشن (۱۵۲ صفحات پر مشتمل) اُردو ڈکشنری بورڈ (ترقی اُردو بورڈ)، کراچی میں میرا دیکھا ہوا ہے۔ (نمبر داخلہ: ۳۹۱۶) (باقی اگلے صفحے پر)

کے بعد ایک نسخہ فراہم کرکے اس کا نمونہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے وہی یہاں نقل کیا جاتا ہے:

داستان سواری کی تیاری

"جب گیارہ برس خیریت سے گزرے، بارہواں برس آیا، الحمدللہ جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں چاروں طرف مچ گئی۔ مبارکبادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارہویں سال کی — کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرش بیگم کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کر میں شہزادے کو لے کر سوار ہوں گا تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہوا اور بستی اُن کے دل کی بھی آباد ہو۔ تم نقیبوں کو تقید کرو گھر گھر یہ حکم پہنچا دیں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگ مگا ہو۔ خبردار ایک سوار میلا اور ایک گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے۔ احیاناً کسی کو

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحے سے) خاتمۂ کتاب (ص ۱۵۲) کی عبارت یہ ہے: "الحمدللہ کہ یہ کتاب دلپذیر یعنی نثرِ بے نظیر اول جون سنہ ۱۸۷۰ء کو دارالامارۃ کلکتہ میں چھپ کر تیار ہوئی"۔ کتاب کا سرورق موجود نہیں ہے۔ 'نثرِ بے نظیر' کا یہی ایڈیشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں بھی کیٹلاگ نمبر: ۹۱۱۴۳۸۲/م/ل ۹۳ ن کے تحت محفوظ ہے۔ یونیورسٹی لائبریری کے اس نسخے کے شروع اور آخر دونوں طرف انگریزی حروف میں ٹائٹیل موجود ہے جس کے مطابق 'نثرِ بے نظیر' کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے اور ——— W. NASSAU LEES, LL.D ممبر اینڈ سیکرٹری بورڈ آف اگزامنرز کی نظرِ ثانی اور تصحیح کے بعد کالج پریس، کلکتہ سے ۱۸۷۰ء میں چھپا۔ کتاب کیارُدو میں سرٹیفکیٹ آف ہائی پروفیشنسی کے امتحان کی ٹیکسٹ بکس میں سے ایک بنایا گیا ہے اور اسے جونیر ممبرز آف ہر میجسٹیز انڈین سول اینڈ ملٹری سروسز کے استفادے کے لیے شائع کیا گیا۔ [مُرتب]

اس وقت اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ مابدولت کی رضی اور خوشی اسی میں ہے۔ نظم:

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند — سواری کا ہو نور جس سے دوچند

اتنے میں شام پڑی۔ آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا۔ مہتاب سورۂ نور پڑھتا ہوا نکلا۔ حضرت محل میں تشریف لے گئے۔ تمام رات ناچ راگ رہا۔ مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا۔ نظم:

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید — عجب روز تھا مثل روزِ اُمید

القصہ رات آخر ہوئی۔ چاند نے بالینِ استراحت پر اپنا سر رکھا اور سورج بڑی چمک سے آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا۔ نظم:

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو — کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

(نثرِ بے نظیر مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۰ء ص ۲۷)

نثرِ بے نظیر کی یہ عبارت مثنوی میر حسن کا ایسا خلاصہ ہے جس میں مرتب نے اپنے آپ کو پوری طرح اصل منظوم قصے کے حدود میں رکھا ہے۔ اپنی نثر سے وہی سماں پیدا کرنے اور فضا بنانے کی کوشش کی ہے جو نظم کے قصے میں ہے۔ عبارت سہل اور اردو روزمرہ کے مطابق ہے۔ گو مولف نے عبارت کو مقفیٰ بنا کر اُسے ادبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس التزام سے کہ عبارت کی روانی میں فرق نہیں آیا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ روانی اور بے تکلفی کے باوجود عبارت میں گھلاوٹ اور شگفتگی نہیں۔ بہ حیثیتِ مجموعی یہ عبارت انشا کے محاسن اور تاثیر کے اعتبار سے میر امن اور حیدری کی عبارتوں سے کم تر اور افسوس کی عبارت سے بہتر ہے۔

اخلاقِ ہندی: حسینی کا دوسرا کارنامہ 'اخلاقِ ہندی' اُن کی پہلی کتاب سے زیادہ معروف ہے [1] اور حسینی کی شہرت بھی پہلی کتاب کے مقابلے میں دوسری

---

[1] ایک حالیہ اشاعت: 'اخلاقِ ہندی'، میر بہادر علی حسینی، مجلسِ ترقی ادب' لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء مقدمہ (حالات، تصانیف، تجزیاتی مطالعہ)، ڈاکٹر وحید قریشی، ص ۷ - ۴۸ [مرتب]

کتاب کی بدولت زیادہ ہے۔ حسینی نے بقول خود ڈاکٹر گلکرسٹ کے ارشاد پر مفرح القلوب کو سلیس رواجی ریختہ" میں ترجمہ کرکے اس کا نام" اخلاقِ ہندی" رکھا[1]۔ اخلاقِ ہندی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایسی اخلاقی کہانیوں کا مجموعہ ہے، جو پڑھنے والے کے لیے نصیحت حاصل کرنے کا باعث بن سکیں۔ مفرح القلوب، کے مولف نے اس کتاب کی تقریب یوں بیان کی ہے کہ مانک پور نامی ایک شہر میں راجہ چندر سین حکومت کرتا تھا۔ اُس کے بیٹے نالائق تھے۔ باپ اُن کی یہ حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوتا لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ اُن کی اصلاح کیوں کر کرے۔ راجہ نے ایک دن اپنے درباریوں سے ان کی اصلاح کے متعلق مشورہ کیا تو ایک درباری نے جس کا نام پنڈت بشن شرما تھا۔ اُن کی اصلاح کرنے کا بیڑہ اُٹھایا اور اُنھیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا۔ بشن شرما نے

---

[1] حسینی کا رکھا ہوا نام 'اخلاقِ ہندی' اس لحاظ سے بے حد موزوں ہے کہ گو یہ کتاب فارسی کی ایک کتاب کا اُردو ترجمہ ہے لیکن فارسی کتاب کی اصل ایک ایسی کتاب ہے جو خالص ہندوستانی کہانیوں کا مجموعہ ہے اور فکر و تخیل اور اسلوب ہر اعتبار سے خالص ہندی مذاق کا ترجمان ہے۔

قصہ گوئی کی تاریخ میں مصر کے بعد سب سے نمایاں جگہ ہندوستان کو ملتی ہے اس لیے کہ اس کی قدیم کہانیاں مختلف راستوں سے دنیا کے مختلف ملکوں میں پہنچیں اور وہاں کی قصہ گوئی اور داستان سرائی کی بنیاد بنیں۔ ان قدیم کہانیوں میں سب سے اہم جانوروں کی وہ کہانیاں ہیں جو اپنی اخلاق کی بنیاد کی وجہ سے ہر ملک اور زبان میں بے حد مقبول ہوئیں۔ تحقیق نے یہ بات ثابت کی ہے کہ ان اخلاقی کہانیوں کی جنم بھوم ہندوستان ہے۔

ان قدیم ہندوستانی کہانیوں کا پہلا سرچشمہ وہ جاتک (دیا گا تھا) جو بعض بیانوں کے مطابق گوتم بدھ کے ان اخلاقی دو میوں سے مرتب کیے گئے ہیں جو وہ اپنے عقیدتمندوں کو سنایا کرتے تھے۔ ان کہانیوں کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح ہے۔ ان جاتکوں میں بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جو ہمیں ایسپ کی کہانیوں میں ملتی ہیں جو یونانی کہانیوں کا دوسرا بڑا سرچشمہ پنچ تنتر ہیں۔ اس کا شمار دنیا کی بڑی کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کے جتنے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوئے، کہا جاتا ہے کہ کسی اور کتاب کے نہیں ہوئے چنانچہ انوار سہیلی کی اصل بھی یہی ہے اور سنسکرت میں دوسری کہانیوں کے مجموعے برہت کتھا منجری، کتھا سرت ساگر، ہتوپدیش اور شک سپتتی بھی (جن میں جانوروں کی بہت سی کہانیاں ہیں) اپنی اصل کے اعتبار سے پنچ تنتر کی طرف لوٹتے ہیں (باقی آگے)

شہزادوں کو ایسے قصے سنائے کہ اُن کی حالت سُدھر گئی۔ وہی قصے ہتوپدیش میں ہیں اور انھیں کا فارسی میں ترجمہ مفرح القلوب ہے، یہ اخلاقِ ہندی' کے نام سے اُردو میں منتقل ہوا ہے۔

اُخلاقِ ہندی' کے چار باب ہیں۔ پہلے باب میں دوستوں کی دوستی کا، دوسرے میں

(حاشیہ بہ سلسلۂ صفحۂ گزشتہ) سنسکرت کے جو قصے فارسی یا بھاشا کے وسیلے سے اُردو میں منتقل ہوئے ہیں اُن سب میں کچھ نہ کچھ چیزیں جاتک اور پنچ تنتر سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں طوطا کہانی، باغِ اُردو' اخلاقِ ہندی' خرد افروز' بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، بستانِ حکمت اور الف لیلہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ سب کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

ان مجموعوں میں سے طوطا کہانی' باغ اردو' اخلاقِ ہندی' خرد افروز' بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی فورٹ ولیم کالج کے مصنفین اور مولفین کے ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ طوطا کہانی اور باغ اُردو کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ باقی کتابوں کا تذکرہ اپنے اپنے محل پر کیا جائے گا اس جگہ اخلاقِ ہندی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ اس کتاب کی اصل بھی سنسکرت کی ایک کتاب 'ہتوپدیش' ہے جو ۱۰۰۰ء کے قریب نرائن بھٹ نامی ایک شخص نے پنچ تنتر اور دوسرے سنسکرت ماخذوں سے مرتب کی تھی۔ اس کتاب کے ترجمے اُردو' ہندی اور فارسی کے علاوہ' انگریزی' فرانسیسی' جرمن اور یونانی وغیرہ میں بھی ہوئے ہیں۔ فارسی میں اس کے جو ترجمے ہوئے اُن میں 'نگارِ دانش' اور 'مفرح القلوب' زیادہ مشہور ہیں۔ 'مفرح القلوب' کے مرتب کا نام مفتی تاج الدین ہے۔ 'مفرح القلوب' کے سببِ تالیف کے متعلق حسینی نے اپنے دیباچہ میں مندرجہ ذیل حکایت بیان کی ہے:

"یہ کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے، جس کی تخت گاہ صوبۂ بہار تھی، پہنچی۔ جب اُنھوں نے سنا اس میں قصّے از بسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت بھی نہایت مرغوب اور باتیں بھی خوب اور حکایتیں اکثر مفید تب اپنے ملازموں میں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعے میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب اُن میں سے ایک شخص (مفتی تاج الدین) حکم بجا لایا اور نام اس کا مفرح القلوب رکھا۔"

اُن کی جُدائی کا۔ تیسرے میں لڑائی کی ایسی باتوں کا جن میں اپنی فتح اور دشمن کی شکست کا بیان اور چوتھے میں میل ملاپ کی کیفیت کا مذکور کہانیوں کی صورت میں کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں کلکتہ سے چھپی۔ گریرسن کے بیان کے مطابق[1] اس کے متعدد ایڈیشن بمبئی، مدراس، بنگلور، کلکتہ اور لندن سے چھپے۔ ارباب نثرِ اُردو نے بمبئی کے مطبع فتح الکریم کے ایک نسخے (مطبوعہ ۱۳۰۵ھ) سے اس کی ایک حکایت نمونے کے طور پہ نقل کی ہے وہی ذیل میں درج ہے:

"ایک پُرانے سانپ کہ اُس میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی ایک جھیل کے کنارے پہ آہستہ آہستہ آکر غمگین ہو بیٹھا۔ تب مینڈکوں کے بادشاہ نے اُس سے پوچھا "اے سانپ! تجھے کیا ہوا ہے جو اتنا دلگیر ہے"۔ اُس نے جواب دیا کہ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی نبیڑ، مینڈک بولا "اے سانپ ناخوش کیوں ہوتا ہے، اگر کچھ تیری چیز باقی میں گر پڑی ہو تو کہہ دے۔ اپنے لشکر کو حکم کروں کہ بجنسہٖ اس چیز کو ڈھونڈ لاوے"۔ اس نے کہا "اے مینڈک! اس شہر میں ایک برہمن کا لڑکا بہت خوبصورت تھا، اس کو میں نے کاٹا۔ ماں باپ نے اس کے درد سے کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔ اس کے بھائی نے اس کو سمجھا بجھا کر کھلایا پلایا۔ یوں اُسے نصیحت کی کہ بھائی صبر کیجیے۔ سب کی یہی راہ ہے۔ چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ شعر:

مت پوچھ رفتگاں کو کدھر ہیں کہاں نہیں
شاہانِ نامور اور دلبنیں جو نوجواں نہیں[2]

تب برہمن یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا کہ اے دوستو! میں اس گاؤں میں نہ رہوں گا، کس واسطے کہ یہی ایک لڑکا میرا تھا سو خدا کی راہ میں گیا۔ اب مجھے بستی سے کیا کام، بن باسی رہوں گا۔ تب اُنھوں نے کہا "اے بھائی

[1] لنگوئسٹک سروے آف انڈیا، جلد نہم، حصہ اوّل۔
[2] ارباب نثرِ اُردو نے یہ شعر معذرت کے ساتھ نقل کیا ہے اور دلبنیں کے بجائے نشیں لکھی ہے "نہیں" میری تحریف ہے۔

کوئی داڑھی منڈھانے اور جامہ پھاڑ کر جنگل میں جا رہنے سے سادھو نہیں ہوتا، مگر جس کی کرنی اچھی ہو"۔ سو اے مینڈک! میں نے اس وقت خواب دیکھا کہ ایک مرد بوڑھا نہایت بزرگ صورت مجھ سے یوں کہتا ہے کہ اے سانپ تو نے اس لڑکے بیٹے کو ناحق کاٹا، کل قیامت کو تیری پیٹھ پر مینڈک سوار ہوں گے اور اسی عذاب میں ہمیشہ خدا تجھے گرفتار رکھے گا۔ اگر اس عذاب سے چھٹکارا چاہے تو کنارے جھیل کے جہاں مینڈک بہت سے ہوں جا کر اُن کے سردار کو اپنی گردن پر سوار کر کے لیے پھرا کر۔ مینڈک یہ بات سنتے ہی نہایت خوش ہو کر اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا نے مجھے مفت یہ گھوڑا دیا۔ شاید میرے طالعوں کی مدد سے ایسی سواری ملی، اُسی وقت سانپ کی پیٹھ پر چڑھ بیٹھا اور کہا: "فلانی جگہ میرا دشمن ہے اگر تو تصدیع کر کے مجھے وہاں تک لے چلے تو میں اُسے ماروں"۔ سانپ نے یہ بات نہ مانی۔ سب مینڈکوں کو اپنی جلو میں آگے رکھ کے چلا۔ جب اس تالاب کو چھوڑ کر آگے بڑھے، سانپ نے جانا کہ اب یہ بھاگ کر اس تالاب تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ کسی بہانے زمین پر اپنے کو گرا دیا۔ مینڈکوں کے سردار نے پوچھا "تو کیوں گر پڑا؟" اس نے کہا کہ تیری فوج کو دیکھ کر مجھے بھوک لگی ہے"۔ وہ بولا کہ میرے لشکر سے دو چار مینڈکوں کو کھا لے۔ سانپ نے کہا: "اے بادشاہ! لشکر کم ہونے سے تجھ کو بُرا لگے گا"۔ وہ بولا "ترے کھانے سے میری فوج کم نہ ہو گی"۔ سانپ ہر روز دو تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا۔ اکیلا بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا: "اے بادشاہ! آج میں کیا کھاؤں، مجھے بھوک لگی ہے؟"۔ مینڈک نے کہا "اے سانپ کسی جھیل کے کنارے چل کر اپنا پیٹ بھر لے"۔ تب اس نے کہا: "تمہارے لشکر نے میرے پیٹ میں چھاؤنی کی ہے۔ بادشاہ کا لشکر سے جُدا رہنا

خوب نہیں۔ اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاؤنی میں داخل ہوں تو بہتر ہے'۔ تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہ سوار کو زمین پر پٹک کر کوڑے دُم کے مارے اور کھا گیا۔ جیسا کہ کسو شاعر نے کہا ہے، فرد :

گردنِ بندگی نت خم ہے درِ فرمان پر
گوئے سر اپنا فدا کیوں نہ کرے چوگان پر

(اخلاقِ ہندی مطبوعہ ۱۳۰۵ھ صفحہ ۱۷۰)

'اخلاقِ ہندی' کی یہ کہانی فورٹ ولیم کالج کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق بول چال کی عام فہم اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہے اور کہانی لکھنے والے کی کوشش یہ ہے کہ عبارت میں کوئی لفظ ایسا نہ آئے جس سے اس میں ثقل یا گرانی پیدا ہو جائے: اُسے اس کوشش میں کامیابی ہوئی ہے لیکن عبارت میں بالارادہ سادگی اور بے تکلفی پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس میں روانی باقی نہیں رہی بلکہ کہیں کہیں سلاست بھی قائم نہیں رہی۔ عبارت میں جا بجا ربط کی بھی کمی ہے۔ کہانی کے مختلف جملوں میں جو ربط، تسلسل اور روانی ہونی چاہیے وہ اس میں موجود نہیں۔ جملوں میں اس طرح کا ربط اور آہنگ پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات ایسے لفظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے کسی طرح بھی یہ ربط پیدا نہیں ہوتا: 'تب' کی تکرار اس بے ربطی کی نمایاں مثال ہے۔ جملوں میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر بھی بعض جگہ درست نہیں' کہانی میں شاذ و نادر جو شگفتہ اور لطیف فقرے آ جاتے ہیں وہ موجود نہ ہوتے تو عبارت بالکل بے مزہ اور روکھی پھیکی ہوتی۔

تاریخِ آسام : حسینی کی تیسری کتاب تاریخِ آسام ہے جو شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تاریخِ آسام کا ترجمہ ہے۔ طبقات الشعرا کی روایت کے مطابق یہ ترجمہ حسینی نے ۱۸۰۵ء میں ختم کیا تھا۔ اصل کتاب بعض کتب خانوں میں موجود ہے۔ حسینی کا ترجمہ تقریباً نایاب ہے۔ نصیر الدین ہاشمی (مولف دکن میں اُردو) کے بیان

کے مطابق اس کا ایک قلمی نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں موجود ہے۔ کتاب کی عبارت کا نمونہ بھی اُنھیں کے ایک مضمون میں دیا گیا ہے جو 'اربابِ نثرِ اُردو' کے حوالے سے درج ذیل ہے :

"شہر رجب کی بیسویں تاریخ کلیابر سے کوچ ہوا۔ آگے وہاں سے دو منزل تک لشکر کا کنارہ پکڑ کر چلنا، مہا پتر ندی کے سبب' جو پہاڑ کے جڑ میں کو ہو کر بہتی ہے مقدور نہ تھا۔ اس لیے لشکر اور نواڑے کے درمیان بڑا پیچ پڑ گیا۔ ابن حسین نواڑی کا داروغہ جو تھا، سو نواب کے حکم سے بعضے بعضے کام سنوارنے کے لیے فتح نشان چندوں کے ساتھ رہ گیا تھا۔"

رسالہ گلکرسٹ : حسینی کی ایک اور تالیف جو اُن کی دوسری تالیفات کے مقابلے میں یقیناً زیادہ اہم ہے اُن کی قواعد اُردو ہے جو "اردو رسالہ گلکرسٹ" کے نام سے مشہور ہے[1]۔ اس رسالہ کا ذکر ڈاکٹر گلکرسٹ کی تالیفات کے ضمن میں آ چکا ہے۔ حسینی کا یہ رسالہ ۱۸۱۶ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کی بعض دوسری کتابوں کی طرح یہ بھی تقریباً نایاب ہے۔ صاحبِ اربابِ نثرِ اُردو نے اس کے دو نسخوں کا حوالہ دیا ہے، ایک قلمی اور دوسرا مطبوعہ (۱۸۰۲ء) دونوں نسخے مولوی عبد الحی صاحب حیدر آبادی کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

حسینی کلامِ پاک کے اُس ترجمے میں بھی شریک تھے جو ڈاکٹر گلکرسٹ نے کالج کے زیرِ اہتمام شروع کروایا تھا۔ یہ کام ڈاکٹر گلکرسٹ کے چلے جانے کی وجہ سے ادھورا رہ گیا اور اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے کس حصے کا ترجمہ اُنھوں نے کیا تھا۔ قرآن شریف کے اس ترجمے کا ذکر مولوی امانت اللہ کے ضمن میں ذرا وضاحت سے کیا جائے گا۔

---

[1] بعض اہلِ علم اس سے متفق نہیں ہیں کہ قواعدِ زبانِ اُردو (عرف رسالہ گلکرسٹ) میر بہادر علی حسینی کی تالیف ہے، دیکھیے: ڈاکٹر محمد انصار اللہ: قاعدۂ ہندی ریختہ، مطبوعہ علی گڑھ مئی ۱۹۷۳ء۔ (مرتب)

مرزا علی لُطف :

مرزا علی لطف مرزا کاظم بیگ خاں کے بیٹے تھے، جن کے آبا و اجداد کا وطن استر آباد (ایران) تھا۔ ۱۷۴۱ء / ۱۱۵۴ھ میں نادر شاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور دہلی کو اپنا وطن بنا لیا۔ نواب آصف الدولہ کے دادا ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے محمد شاہ (شاہ دہلی) تک رسائی ہوئی اور دربار سے تعلق پیدا ہو گیا۔

مرزا علی دہلی میں پیدا ہوئے لیکن کسی تذکرے سے اُن کی تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔ لطف نے ابتدائی تعلیم دہلی میں رہ کر حاصل کی۔ فارسی میں والد کے شاگرد تھے۔ شاعری نوعمری میں ہی شروع کر دی تھی اور اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ مختلف تذکرہ نویسوں میں اس بات پر اختلاف ہے کہ وہ کس کے شاگرد تھے، کوئی میر کا شاگرد کہتا ہے، کوئی سودا کا۔ خود لُطف نے اپنے تذکرے 'گلشنِ ہند' میں اپنے متعلق یہ لکھا ہے "مشورہ ریختہ کا اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے" [1]

دلّی تباہ ہوئی تو لطف عرصے تک یہیں رہے لیکن بالآخر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ پہنچے۔ وہاں شہزادہ جواں بخت کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ انھوں نے کلام سُنا اور پسند فرمایا۔ ان دنوں لکھنؤ شعر و شاعری کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ بڑے

[1] اس اختلافِ رائے کی تفصیل اربابِ نثرِ اُردو میں مرزا علی لُطف کے ذکر میں موجود ہے۔

بڑے شاعر اپنی جولانیِ طبع دکھا رہے تھے اور فضا ان کے نغموں اور چشمکوں سے گونج رہی تھی۔ وہاں کی فضا لطف کو سازگار نہ معلوم ہوئی اور حیدر آباد کے لیے رختِ سفر باندھا۔ پہلے کچھ عرصہ پٹنہ (عظیم آباد) میں رہے۔ ارادہ تھا کہ کلکتہ کی سیر کرتے ہوئے حیدر آباد جائیں گے لیکن یہاں ڈاکٹر گلکرسٹ سے ملاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے اردو شاعروں کا تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے اسی فرمائش پر اپنا معرف اور قابلِ قدر تذکرہ "گلشنِ ہند" مرتب کیا۔ اُنھوں نے گلشنِ ہند کے دیباچے میں اس کی تالیف کے متعلق جو ضروری باتیں لکھی ہیں اُنھیں 'اربابِ نثرِ اُردو' اور 'داستانِ تاریخِ اُردو' کے حوالے سے [1] درج ذیل کیا جاتا ہے :

"علی ابراہیم خاں [2] مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان فارسی میں لکھا اور نام اس کا گلزارِ ابراہیم رکھا ہے [3] گیارہ سو اٹھانوے (۱۱۹۸ ہجری) اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی (۱۷۸۴ء) میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ نکتہ دانی، رونق افزائے محفلِ معانی، سخن کی جان اور سخندانوں کے قدر دان صاحب والا مناقب مسٹر گلکرسٹ صاحب کی نظرِ مبارک سے گزرا، از بسکہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحبِ عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھاوے

[1] مرزا علی لُطف کے بارے میں بعض دیگر اہم ماخذ یہ ہیں :

i) حیاتِ لطف، ڈاکٹر شفیعہ شوکت، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۲ء

ii) اُنیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب، ڈاکٹر جاوید نہال، کلکتہ۔

iii) مرزا علی لُطف "حیات اور کارنامے"، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، حیدر آباد دکن، ۱۹۷۹ء [مرتب]

[2] ان کا حال حیدر بخش حیدری کے سلسلے میں حاشیے میں لکھا جا چکا ہے۔

[3] گلزارِ ابراہیم، از علی ابراہیم خلیل (مقدمہ: محی الدین قادری زور)، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۳۴ء (مرتب)

تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے اور نو مشق کیفیت بہت اُٹھائیں گے۔ چنانچہ اس خیر خواہ خفی و جلی مرزا علی کو کہ لطف تخلص کرتا ہے، نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں۔ اگرچہ یہ پابندِ الفت کا اُن دنوں ارادہ حیدر آباد کی سیر کا رکھتا تھا لیکن اس خلقِ مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں اور ایک سرِ مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔

غرض مدعائے دلی اس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد یہی ہے کہ صاحبانِ انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم اُن کی تربیت کے لیے یہ خونِ جگر کھاتے ہیں تاکہ اُن کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت بخوبی اس سے مزہ اُٹھا دے۔ از بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی آوے تو ایسا جن کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ایسا جس کو پڑھ کر کہیں واہ واہ"۔

الحمد للہ آج کے دن کہ بارہ سو پندرہ ہجری (۱۲۱۵ھ) اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں، موافق حکم اُس صاحب والا مناقب کے کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچ مداں نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے 'گلشنِ ہند' رکھا[۱]۔

لطف کے تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد جیسا کہ اُن کے بیان سے ظاہر ہے تذکرۂ گلزارِ ابراہیم ہے

---

[۱] تذکرۂ "گلشن ہند" کے بارے میں تفصیلات کے لیے رجوع کیجیے:

(i) اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۱۰-۲۱۳

(ii) شعرائے اُردو کے تذکرے، ڈاکٹر حنیف نقوی، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء، ص ۵۹۶-۶۱۶ [مرتب]

لیکن مصنف نے اس میں اپنی طرف سے بہت سے اضافے کیے ہیں اس لیے اُن کا تذکرہ محض ترجمہ ہونے کے بجائے ایک قابلِ قدر تالیف ہے۔

مؤلف کے دیباچے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ گلشن ہند دو جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا[۱]۔ لیکن اس کی جلد دوم اب بالکل ناپید ہے۔ ۱۹۰۶ء میں جلد اوّل کو مولانا شبلی کے حواشی اور مولوی عبد الحق صاحب کے مبسوط مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا۔ شائع شدہ تذکرے میں ۶۹ شاعروں کا حال ہے۔ حالات مرتب کرتے وقت لطف نے ان میں بعض قابلِ قدر اضافے کیے ہیں لیکن بعض جگہ زیبِ داستاں کے لیے ایسی چیزیں بھی بڑھا دی ہیں جو تاریخی حیثیت سے مستند اور قابلِ قبول نہیں ہیں[۲]۔

مرزا علی لطف کا تذکرہ اس لحاظ سے یقیناً قابلِ قدر ہے کہ وہ اُردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ہے جو اُردو میں لکھا گیا[۳] اور جس میں پہلی مرتبہ شاعروں کے حالات کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے لیکن اس کا اندازِ بیان تذکرہ نگاری کے لیے یقیناً موزوں نہیں۔ لطف مقفیٰ عبارت لکھنے کے شائق اور عادی ہیں، اور اس شوق اور عادت نے اُن کی عبارتوں میں اکثر اُلجھن اور تعقید پیدا کر دی ہے۔ اُن کا بیان تشبیہ و استعارے کی کثرت سے اس درجہ گراں بار ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات تذکرہ و حقیقت معلوم ہونے کے بجائے محض داستان سرائی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لطف کی نثر میں عربی فارسی الفاظ بھی اتنی کثرت سے ہیں کہ وہ مبتدیوں کے لیے جن کی خاطر اسے مرتب کیا گیا ہے بعید از

---

[۱] اس ضمن میں لطف کی عبارت یہ ہے: "گلشنِ ہند کی دو جلدیں ہیں۔ جلد اول جو تحریر کی جاتی ہے اس میں عرش پرواز زباں، سلاطین نامدار کی اور گوہر بار بیاں، وزرائے والا تبار کی اور خوش استعدادیاں اُمرائے عالی مقدار کی اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی جو کہ نام آور صاحبِ دیواں تھے بیان کی گئی ہیں۔ جلد دوم میں مذکور کیے گئے ہیں، شعرائے گمنام و غیر یا نو مشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی"۔

[۲] اس طرح کی بعض باتیں صاحب اربابِ نثرِ اُردو نے لطف کے بیان میں لکھی ہیں۔

[۳] ڈاکٹر فرمان فتح پوری (اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۳) اور ڈاکٹر اقتدا حسن (سہ ماہی اُردو، کراچی جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۵۴۔۵۵) مرزا علی لطف کے تذکرے "گلشن ہند" کے مقابلے میں حیدر بخش حیدری کے تذکرے "گلشنِ ہند" کو اُردو زبان میں تذکرہ نگاری کی پہلی مثال قرار دیتے ہیں۔ [مرتب]

فہم ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفین و مولفین کے مقابلے میں لطف کا اندازِ بیان روزمرہ سے اور اس قدیم زبان سے قریب تر ہے جس میں متروکات کی تعداد خاصی ہے۔

تذکرۂ گلشن ہند کے دو ایک اقتباسات سے اُن کے طرزِ نگارش کی خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میر تقی میر کے حال میں لکھتے ہیں:

"ناقدر دانی سے اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہلِ دُنیا کی، اب بازارِ سخن سازی اس درجہ کاسِد ہے اور ہوائے شہرستانِ معنی طراز اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاریٔ سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا اور جادو طرازیٔ بیان میں معانی پرواز ہے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے۔"

قائم چاندپوری کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

"قائم تخلص، شیخ محمد قائم نام، متوطن چاندپور ندیبہ کے۔ نظمِ ریختہ میں اُستادِ مسلم الثبوت تھے۔ ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے عشق میں مشورہ سخن کا اُنھوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا و میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طوطیٔ گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شیریں مقال کے اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اس کی آئینہ کو طلب صفائی دام اور خجالت سے اس کلام رنگیں کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی اور موج زنی اس طبع معانی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا اس جہانِ فانی سے اُٹھ جانا اور داغِ حسرت سے دلوں کو اربابِ فہم کے جلانا۔"

مولوی امانت اللہ شیدا:

مولوی امانت اللہ شیدا کے حالات نہ کسی تذکرے و تاریخ میں مذکور ہیں نہ خود ان کی تالیفات سے ان پر کوئی روشنی پڑتی ہے[1]۔ ان تالیفات کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ عربی و فارسی کے متبحر عالم تھے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانے میں کالج میں ملازم ہوئے اور ان کے کہنے سے ہدایت الاسلام کے حصّہ دوم، اخلاق جلالی اور قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔

کالج سے متعلق ہونے سے پہلے مولوی صاحب نے فقہ اسلامی کے متعلق ایک ضخیم کتاب عربی میں لکھی تھی اس کا نام ہدایت الاسلام تھا۔ عربی پڑھنے والوں کا حلقہ چونکہ محدود تھا اس لیے اس کتاب کا ترجمہ اُنھوں نے اُردو میں کیا اور اس کا نام بھی ہدایت الاسلام رکھا۔ فورٹ ولیم کالج میں اُردو نثر لکھنے والوں کی جو قدر و منزلت تھی اُسے دیکھ کر اُنھوں نے وہ ترجمہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے سامنے پیش کیا۔ موصوف نے ترجمے کو پسند کیا اور مولوی صاحب کے علم و فضل سے متاثر ہو کر اُنھیں کالج کے حلقۂ مولفین و مترجمین میں شامل کر لیا۔ مولوی صاحب نے اب تک ہدایت الاسلام کا ترجمہ مکمل نہیں

[1] امانت اللہ شیدا کے حالات اور اُن کی تالیفات کے ضمن میں دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات: ڈاکٹر عبیدہ بیگم، لکھنؤ، صفحہ ۱۷۰-۱۷۲، ۴۳۳-۴۳۹ اور صفحہ ۴۶۳ تا ۴۶۹، ۶۱۴-۶۱۵ (مرتب)

کیا تھا لیکن جلد اول جو ڈاکٹر گلکرسٹ کی خدمت میں پیش کی تھی وہ ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے کالج کی طرف سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔

کالج کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں ملازم ہو کر مولوی امانت اللہ نے حمایت الاسلام کی دوسری[1] جلد کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر گلکرسٹ کے مشورے پر قرآن شریف کا ترجمہ شروع کیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کا خیال تھا کہ اُردو ادب کا مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات قرآنی آیات کے جو حوالے آجاتے ہیں اُنھیں سمجھنے کے لیے قرآن کے ایک عام فہم ترجمے کی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے ماتحت اُنھوں نے مولوی امانت اللہ کے سپرد یہ کام کیا۔ اور میر بہادر علی حسینی کو اس کام میں ان کے ساتھ شریک کیا۔ بعد میں کالج کے دوسرے اہلِ علم بھی اس کام میں شامل ہو گئے لیکن ۱۸۰۴ء کے آخر میں ڈاکٹر گلکرسٹ کو صحت کی خرابی کی وجہ سے کالج کی ملازمت ترک کر کے وطن واپس جانا پڑا۔ اُن کے جانے کے بعد اُن کے جانشینوں نے قرآن شریف کے ترجمے کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور یہ کام بند ہو گیا۔ اُس وقت تک جو ترجمہ ہو چکا تھا وہ بھی کالج کی طرف سے نہیں چھپا۔[2] البتہ کالج کے باہر کسی نے ترجمہ کا یہ حصّہ جو سورۂ فیل سے آخرِ قرآن تک ہے شائع کر دیا۔ صاحب اربابِ نثر اُردو کو ایک نسخہ بمبئی کے ایک قدیم کتب خانہ میں ملا۔ انھوں نے اپنی قابلِ قدر تالیف میں اس کا ایک

---

[1] "ہدایت الاسلام" دو جلدوں پر مشتمل تھی پہلی جلد ۱۸۰۴ء میں دو حصّوں میں ہندوستانی پریس سے شائع ہوئی جو ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ دوسری جلد کا پتہ نہ چل سکا۔ تھامس روبک کے مطابق یہ (۱۸۱۹ء تک) طبع نہ ہو سکی تھی۔ ہدایت الاسلام کی پہلی جلد میں گلکرسٹ کا انگریزی زبان میں دیباچہ ہے لیکن یہ ادھورا ہے۔" بحوالہ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص۲۶۴ [مرتب]

[2] قرآن مجید کے اُردو ترجمے کے بارے میں ضروری کوائف کے لیے دیکھیے:
گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۵-۱۵۷، ۱۶۳، (مرتب)

اقتباس دیا ہے جو درج ذیل ہے:

"اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں مگر خدا پر ہی ہے اُس کی روزی اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھیراؤ کو اور اُس کے سونپے جانے کی جگہ کو۔ سب کچھ روشن کتاب میں ہے اور وہی تو وہ خدا ہے جس نے بنا ڈالا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں، اور اس کا عرش پانی پر تھا کہ آزمائے ہمیں کہ کون ہے تم میں سے بہتر چال چلن کی راہ سے۔ اور اگر کہتا ہے تو کہ ضرور تم اُٹھائے جاؤ گے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں یہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ (بارہویں پارے کا شروع)

ہدایت الاسلام کا ایک نسخہ بمبئی کے ایک قدیم کتب خانے میں محفوظ ہے[1]۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں: فرض کی یا نفل کی نماز کعبہ کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا مُنہ امام کے مُنہ کی طرف ہو اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے منہ کی طرف ہو تو نماز اُس کی صحیح نہیں ہوتی ہے اور کعبے کے اوپر مکروہ ہے۔ اور کعبے کے چاروں طرف اقتدا کرنا، گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اُس کی طرف نزدیک ہوں، صحیح ہے۔ پر امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اُسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبے کی طرف نزدیک ہو تو اُس کی نماز درست نہیں کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جاوے گا اور مقتدی کو اُس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔" (ہدایت الاسلام صفحہ ۹۳)

جامع الاخلاق: ڈاکٹر گلکرسٹ کے چلے جانے کے بعد کپتان جیمس ماؤنٹ کالج میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اُنھوں نے فارسی کی معروف کتاب "اخلاقِ جلالی"

---

[1] "ہدایت الاسلام" (مطبوعہ ۱۸۰۴ء) کا ایک نسخہ انجمن ترقی اُردو، کراچی کے کتب خانۂ خاص میں محفوظ ہے دیکھیے تعارفی مقالہ: ڈاکٹر اسلم فرخی "قومی زبان" کراچی، جولائی ۱۹۸۶ء، ص۵-۷۔ [مرتب]

کا ترجمہ کرنے کی خدمت مولوی امانت اللہ کے سپرد کی۔[1] کتاب کے دیباچے میں مولوی صاحب نے ترجمے کی دقتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے کہ ایسی علمی اور دقیق المضمون کتاب کا ترجمہ آسان زبان میں کتنا دشوار ہے۔ کام کی اسی دشواری کا نتیجہ ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی کوشش کو لفظی ترجمے تک محدود رکھا ہے اور اس لیے عبارت میں سادگی و سلاست نہیں پیدا ہو سکی بلکہ اس کے مطالب اکثر پیچیدہ اور مغلق زبان میں ادا ہوئے ہیں اور جا بجا عبارت میں تعقید بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس پُر تعقید اور پیچیدہ عبارت کا ایک نمونہ یہ ہے:

"لیکن بہ مقتضائے اس کے کہ معانی اس کے اسرارِ حکمت پر مشتمل اور احکامِ مصلحت کو شامل تھے، یہ تشبیہ اس خیال سے کہ شاید متناسب الاعضا اور عروسِ خود زیبا کو کیا پرنیاں و کیا دیبا، ہر لباس میں ہے وہ خوشنما اس کی زلفِ مطالب کی عقدہ کشائی ناخنِ فکر کو تیز کر کے عقلِ حکمت شناس کی مشاطگی سے آراستہ کیا۔"

ایسی عبارتوں کی کثرت کے ساتھ ساتھ کتاب میں جا بجا ایسے ٹکڑے بھی نظر آ جاتے ہیں جو سلاست اور صفائی میں فورٹ ولیم کالج کے عام اسلوب سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ایسی عبارت کا ایک نمونہ یہ ہے:

"عدالت پہلے شخص اور اس کے خصائل سے علاقہ رکھتی ہے۔ جیسے اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، پھر اس کے شریکوں کے ساتھ اہلِ خانہ یا شہر کے رہنے والوں میں سے ہوں، اس واسطے پیغمبرِ خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام

[1] مولوی امانت اللہ نے کپتان ماؤنٹ کے حکم پر اخلاقِ جلالی کا ترجمہ 'جامع الاخلاق' کے نام سے کیا۔ 'جامع الاخلاق' کا ۵۰۳ صفحات کو محیط قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے چنانچہ اس کے سنہ ترجمہ کا علم کہیں سے نہیں ہوتا۔ کالج کونسل نے 'جامع الاخلاق' پر مولوی امانت اللہ شیدا کو دو سو روپے بطور انعام دیا تھا۔ بحوالہ: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۴۶۷، ص ۴۶۹ (مرتب)

نے فرمایا ہے کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا نگہبان ہے۔ وہ قیامت میں پوچھا جائے گا ان کے احوال سے۔ اور جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہٗ تعالیٰ کے نور کی مثال ہیں، صحابیوں نے پوچھا "وے کون آدمی ہیں؟" فرمایا وے جو پہلے اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں، پھر اُن کے حق میں جو اُن کے ملک میں اور اُن کے تابع فرمان رہیں"[1]

جامع الاخلاق مولوی امانت اللہ نے ۱۸۰۵ء میں مکمل کی، لیکن وہ کالج کی طرف سے نہیں چھپی بلکہ آگے ۱۸۴۸ء/۱۲۶۴ھ میں غلام حیدر ساکن ہُوگلی نے مطبع احمدی کلکتے سے شائع کیا۔[2]

مولوی امانت اللہ قواعدِ اُردو پر ایک منظوم رسالہ بھی لکھا ہے۔[3] صرف و نحو کے مسائل کو دل نشین بنانے کے لیے انھیں نظم کر دیا گیا ہے، لیکن مولوی صاحب کی نثر کی طرح اُن کی نظم میں جا بجا تعقید ہے۔ نظم کی سی برجستگی و روانی نہیں اور اس لیے دلکشی نام کو نہیں۔[4]

[1] یہ عبارت اربابِ نثرِ اُردو میں دیئے ہوئے ایک اقتباس سے ماخوذ ہے۔

[2] 'جامع الاخلاق' کا یہ ایڈیشن (مطبع احمدی، کلکتہ ۱۸۴۸ء) نستعلیق ٹائپ میں چھپا ہے۔ (صفحات ۳۴۰) اداراردو ڈکشنری بورڈ (ترقی اُردو بورڈ) کراچی کے کتب خانے میں میری نظر سے گزرا ہے۔ نمبر داخلہ: ۲۸۹۹ (مرتب)

[3] یہ رسالہ ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کا نمونہ اربابِ نثرِ اُردو کے صفحہ ۱۶۸/۱۶۹ پر درج ہے۔

[4] مولوی امانت اللہ شیدا نے 'صرفِ اُردو' میں قواعد کے صرفی اور نحوی اصولوں کو نظم کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ 'صرفِ اردو' ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج کاؤنسل کی اعانت سے ہندوستانی چھاپے خانے میں پہلی بار چھپی۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کا کہنا ہے کہ "شیدا نے قواعد جیسے خشک موضوع کو آسان اور عام فہم انداز میں بڑی خوبصورتی سے نظم کیا ہے اور درمیان میں مختلف مثالوں سے وضاحت کی بہت عمدہ کوشش کی ہے۔ انھوں نے مشکل اور ادق الفاظ کی بجائے مناسب اور متوازن الفاظ کا استعمال کیا ہے جو موضوع کے لحاظ سے بہت مشکل کام تھا جس کی بنا پر 'صرفِ اُردو' بہت دلچسپ ہو گئی ہے۔" فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، صفحہ ۶۱۴ (مرتب)

مظہر علی خاں وِلا :

مظہر علی خاں وِلا کے جو حالات مختلف تذکروں میں ملتے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا اصل نام مرزا لطف علی تھا،[1] لیکن عام طور سے مظہر علی خاں کے نام سے مشہور ہیں۔[2] اُن کے والد سلمان علی خاں وداد، عرف مرزا محمد زمان فارسی کے شاعر تھے۔ دادا کا نام محمد حسین اور خطاب علی قلی خاں تھا۔ دہلی کے شرفا میں گنے جاتے تھے باپ دادا کا وطن دہلی تھا۔ وِلا بھی یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔

شیفتہ کے بیان کے مطابق وِلا شاعری میں ممنون[3] کے شاگرد تھے۔ ممنون کے علاوہ مصحفی اور مرزا جان طپش سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی اور اس پر پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کے بھی اچھے عالم تھے۔

وِلا کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ 'ارباب نثر اردو'

---

[1] نام کے متعلق یہ روایت مصحفی اور بینی نرائن جہاں کے تذکروں سے ماخوذ ہے۔

[2] نام کی طرح ان کے تخلص کے معاملے میں بھی تذکرہ نویس متفق نہیں ہیں۔ مصحفی نے باطن اور شیفتہ نے والا لکھا ہے۔ خود انھوں نے اور بعض معاصرین نے وِلا بتایا ہے اور یہی قرینِ قیاس ہے۔

[3] ممنون دہلی کے قریب سونی پت کے رہنے والے تھے ان کے والد قمر الدین منت مشہور شاعر تھے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی روایت کے مطابق ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں موجود تھا۔ شیفتہ کے گلشن بے خار اور بینی نرائن جہاں کے تذکروں میں اُن کے یہ دو شعر نقل کیے گئے ہیں :

یوسف کا جو نقشہ در و دیوار پہ کھینچا ۔۔۔ کیوں تو نے زلیخا نہ دلِ زار پہ کھینچا

ہمدم فقط نہ مجھ کو ہی اس گل نے غش کیا ۔۔۔ آیا جو انجمن میں تو لبِ گل نے غش کیا

وِلا کی تاریخ پیدائش کی طرح اُن کی تاریخ وفات بھی معلوم نہیں۔[1] البتہ ۱۸۱۴ء تک زندہ تھے اس لیے کہ بینی نرائن جہاں کے تذکرے دیوانِ جہاں میں جو ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ میں مرتب ہوا تھا، اُن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ بقیدِ حیات ہیں اور کلکتہ میں مقیم ہیں۔

وِلا فورٹ ولیم کالج کے قائم ہوتے ہی وہاں ملازم ہو گئے تھے۔ کالج کے لیے اُنھوں نے ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۵ء کے درمیان کئی کتابیں مرتب کیں۔ اُن کی تالیفات کے نام یہ ہیں:[2]

(۱) مادھونل اور کام کندلا (۲) ترجمہ کریما (۳) ہفت گلشن (۴) اتالیق ہندی۔
(۵) بیتال پچیسی اور (۶) تاریخ شیر شاہی۔

ان کتابوں میں سب سے پہلی تالیف مادھونل اور کام کندلا ہے جو ۱۸۰۲ء کے اوائل میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)۔۔۔ ممنون نے تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ عرصے تک دربار شاہی سے منسلک رہے فخر الشعرا، خطاب حاصل تھا۔ تذکرہ نویسوں نے کلام کی تعریف کی ہے۔

[1] "۱۲ راگست ۱۸۱۹ء کو شعبۂ ہندوستانی کے پروفیسر ولیم ٹیلر نے وِلا کے انتقال کی خبر دی" فورٹ ولیم کالج (ہندی) لکشمی ساگر وارشنے، ص ۱۰۳، بحوالہ "فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۱۳۵" [مرتب]

[2] مظہر علی خاں وِلا اور ان کی تالیفات کے سلسلے میں مزید مطالعے کے لیے دیکھیے : فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۱۳۰-۱۳۵، ۲۶۳، ۸۲-۴۱۱ - ۴۱۴، ۴۳۰، ۵۰۲، ۵۲۹-۵۳۴ اور صفحہ ۵۹۰ تا ۵۹۴ (مرتب)

مرتب ہوئی۔ یہ قصہ اصل میں سنسکرت میں تھا اور اس کے کئی نسخے مختلف لوگوں سے منسوب ہیں[1]۔ برج بھاشا میں اسے موتی رام کوی نے لکھا تھا[2]۔ اس میں مادھونل نامی ایک برہمن اور ایک رقاصہ کام کندلا کی محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ وِلاؔ نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پہ برج بھاشا سے ترجمہ کیا تھا، لیکن یہ کتاب چھپی نہیں[3]۔ صرف اس کا ایک حصّہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے بیاضِ ہندی میں چھاپا تھا۔ ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے[4]۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے اسی نسخے سے ایک اقتباس لیا ہے جو اربابِ نثرِ اُردو میں درج ہے۔ وہیں سے اس جگہ نقل کیا جاتا ہے:

"بلند بلند مکانوں کے بالاخانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا۔ نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسوں کے چمکنے سے عجیب اُجالا۔ صاحبِ علم و ہنر، نیک افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے۔ وہ پہ پاوتی نگری مشہور تھی اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال

---

[1] ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں اس کا ایک مخطوطہ ۱۵۳۰ء کا موجود ہے۔

[2] موتی رام کوی کی تاریخِ پیدائش ۱۶۸۳ء ہے۔

[3] ڈاکٹر عبادت بریلوی کو مادھونل اور کام کندلا کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے سے ملا۔ قلمی نسخے کے آخر میں تکمیل کا حال اس طرح بیان ہوا ہے:

"دسویں ذی قعدہ کی ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں مع دو تاریخ ہجری و عیسوی کے تمام ہوئی"۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا کہنا یہ ہے کہ یہ نسخہ حسین علی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۰۱ء کے آس پاس لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے پیش لفظ کے ساتھ یہ نسخہ اُردو دنیا کراچی سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہو گیا ہے۔ [مرتب]

[4] مظہر علی ولا کی تالیف کے علاوہ اُردو میں یہ قصہ ایک مثنوی میں بھی نظم کیا گیا ہے۔ مثنوی عباس نامی کسی دکنی شاعر کی ہے۔ سالِ تالیف ۱۲۱۴ ہجری/ ۱۷۸۹ء ہے۔ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا حوالہ ڈاکٹر گیان چند نے "اُردو کی نثری داستانیں" میں دیا ہے۔

خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم و حیا سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب، خلق طالب و مطلوب، دوست اُس کے لُطف سے شاد اور دشمن اُس کے قہر سے برباد۔ جا بجا اُس کی دھاک۔ غرض وہاں راج راجہ اندر کی طرح کرتا تھا۔ اور اس کے محل میں عورتیں ہر ایک ذات کی تھیں، لیکن سب سے بہتر و برتر، پاکیزہ طینت و آراستہ بزیب و زینت، شرم و ادب سے اور علم و ہنر سے مالا مال اور خوبیوں سے اس کی ساری خلقت خوش حال۔ سامانِ عیش و نشاط بلکہ سراپا انبساط، شکل و شمائل پری، سراپا غرور سے بھری، عیش و نشاط کے طور سے آگاہ، شکل میں مانند ماہ، گلبنِ چمنِ شادمانی، گلِ گلزارِ جوانی۔ ابرو کمان، تیر اُس کی ہر اک مژگان۔ ناز و عشوے کے اُس میں تمام آئین، پنٹ حسین و نازنین، اس کی رانی تھی، اور ایک مادھو نام برہمن خوبصورت و خوش سیرت اُس کا بڑا مصاحب تھا"

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق نمبر ۲۱)

ترجمہ کریما: وِلاؔ نے شیخ سعدی کے مشہور پند نامے "کریما" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ تاریخ کے اس مصرعے کے مطابق کہ "ہوا ترجمہ نظم میں یہ وِلاؔ"، سنہ ترجمہ ۱۸۰۲ء نکلتا ہے۔ پہلی مرتبہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اسے "باغِ اُردو" کے ضمیمے کے طور پر کلکتہ سے ۱۸۰۲ء میں شائع کیا تھا۔ پھر ۱۸۰۳ء میں "اتالیق ہندی" کے ساتھ بھی شائع کیا گیا۔ صاحبِ اربابِ نثرِ اُردو نے اپنے قلمی نسخے سے اس کے چند شعر نقل کیے ہیں۔ وہ سادہ اور صاف ہونے کے ساتھ ساتھ لطفِ شعر سے بھی خالی نہیں ہیں[1]

---

[1] اربابِ نثرِ اُردو میں اس ترجمے کے مندرجہ ذیل شعر نقل کیے گئے ہیں ؎

مرے حال پر کر تو بخشش خدا — کہ ہوں میں گرفتارِ حرص و ہوا
نہیں ہے ہمیں داد رس تجھ سوا — تو ہی بخش دے عاصیوں کے گناہ
گنہ سے مجھے باز رکھ اے خدا — گنہ بخش اور راہِ نیکی دکھا

(باقی اگلے صفحے پر)

ہفت گلشن : ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی ایک کتاب کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا اور اسے ۱۸۰۲ء/۱۲۱۶ھ میں ختم کیا۔ بلگرامی کی کتاب میں چونکہ سات باب ہیں اور ہر باب کو گلشن کہا گیا ہے اس لیے ولا نے اس کتاب کا نام ہفت گلشن رکھا۔ کتاب میں آداب معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دی گئی ہے اور ہر بات کی وضاحت کے لیے برمحل اور موزوں حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ کتاب میں احادیثِ نبوی اور حضرت علی کے اقوال بھی درج ہیں۔ یہ کتاب ابھی چھپی نہیں[1] برٹش میوزیم میں ایک قلمی نسخہ ہے، جس کا اقتباس صاحبِ اربابِ نثرِ اُردو نے ڈاکٹر زور کی وساطت سے حاصل کر کے اپنی کتاب میں درج کیا ہے وہی یہاں منقول ہے:

"حکایت چوتھی مرغی اور مور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چُگنے لگی کرناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے سے ایک مارِ سیاہ کے پائے، تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی۔ یہ تمام احوال طاؤس نے اُس درخت کے اوپر سے دیکھ کر کہا 'اے مرغی یہ کیا خیال فاسد تیرے دل میں آیا ہے، مگر انڈے سانپ کے نہیں پہچانے ہیں تو نے۔ بہتر یہ ہے کہ اس بلا سے دست بردار ہو، وِالّا جس وقت کہ بچے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ):

زباں کو دہن بیچ جب تک ہے جا ... ہے مقبول دل کو نبی کی ثنا
ہے نبیوں سے بہتر حبیب اللہ ... کہ عرش بزرگ اس کا ہے تکیہ گاہ
وہ ہے شہ سوارِ بُراق ایسا جو ... کہ اک پل میں آیا فلک پر سے ہو
تری عمر کے گزرے چالیس سال ... نہ طفلی کا اب تک گیا وہ خیال
ہوا و ہوس میں ہی گزری سدا ... نہ تو نیک کاموں میں اک دم رہا
بھروسا نہ کچھ عمرِ فانی پہ کر ... زمانے کی بازی سے مت ہو نڈر

[1] 'ہفت گلشن' کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو برٹش میوزیم لندن میں ملا۔ اب یہ اُن کے تعارف کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، مطبوعہ 'اُردو دنیا' کراچی ۱۹۶۳ء [مرتب]

انڈوں میں سے نکلیں گے تو تجھے مار ڈالیں گے۔' اس بے ہوش نے اُس کی بات کو نہ سُنا اور اپنے کام میں بدستور مشغول رہی۔ لیکن بعد گزرنے چالیس روز کے بچے انڈوں میں سے مانند فراعین کے ایک بارگی جو نکلے تو سارے بدن میں اس کے چمٹ گئے، یہاں تک کہ کام اس کا تمام کیا۔

فائدہ اس قصّے سے یہ ہے کہ جو کوئی نصیحت یارِ صادق اور دوست مشفق کی نہ سُنے آخرِ کار وہ پشیمانی کھینچتا ہے اور اسی طرح سے ہلاک ہوتا ہے۔

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق ۵)

بیتال پچیسی : ولا کی تالیفات میں سب سے مشہور اُن کی کتاب بیتال پچیسی[1] ہے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی قدیم کہانیوں میں سے ہے اور ہندوستان کی معاشرت اور اس کے طرزِ تخیّل کی بڑی صحیح عکاسی کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ ولا اور اُن کے شریکِ کار للّو لال نے اس کے ترجمے میں خیال اور اندازِ بیان میں بڑی دلکش ہم آہنگی رکھی ہے۔ اصل کتاب سنسکرت میں تھی۔ ج بھاشا میں اس کا پہلا ترجمہ راجہ جے سنگھ سوائی، مہاراجہ جے پور کے زمانہ میں ۱۷۴۳ء میں سورتی مصرا کوی نے کیا۔ ولا کا ترجمہ برج بھاشا کے ترجمے کا ترجمہ ہے[2]

---

[1] ایک حالیہ اشاعت: بیتال پچیسی، مظہر علی خاں ولا، مرتبہ: ڈاکٹر گوہر نوشاہی
مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، مارچ ۱۹۶۵ء
حرفِ آغاز و مُقدمہ از: گوہر نوشاہی ص ۱-۲۱
قیمتی ضمیمے: ص ۱۸۱—۱۹۴ [مرتب]

[2] بیتال پچیسی مشرق اور مغرب دونوں میں کس قدر مقبول ہوئی اور اپنی داستانی دلچسپیوں اور معاشرتی خصائص کی بنا پر اس نے کتنی اہمیت حاصل کی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ترجمے مشرق اور مغرب کی بے شمار زبانوں میں ہوئے ہیں۔ جن زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اُن کی فہرست بھی خاصی طویل ہے پھر بھی ان ناموں کا اعادہ شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو اس لیے ان زبانوں کے نام سُن لیجیے جن میں بیتال پچیسی کے نسخے موجود ہیں: (باقی اگلے صفحے پر)

بیتال پچیسی میں پچیس کہانیاں ہیں جو ایک بیتال یعنی بھوت کی زبانی بیان ہوئی ہیں۔ کتاب کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔

بیتال پچیسی اُن کم قدیم کہانیوں میں جن کا ترجمہ سنسکرت یا برج بھاشا سے اُردو میں ہوا ہے سب سے اہم ہے اس لیے کہ اس مجموعے میں جو کہانیاں شامل ہیں وہ قدیم ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کی بڑی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ کہانیوں کے اندازِ فکر اور طرزِ تخیل پر خالص ہندوستانی مزاج کا گہرا عکس ہے۔ کہانیوں میں آنے والے مناظر، ان میں چلتے پھرتے، بولتے چالتے اور مختلف طرح کے کام کاج کرتے ہوئے کردار ان کی گفتار، رفتار، عمل اور ردِ عمل، ان کرداروں سے تعلق رکھنے والے واقعات کی تفصیلات سب چیزوں پر ہندوستانی روایت کا اتنا گہرا نقش ہے جو امتدادِ زمانہ سے نہیں مٹتا۔ کہانیوں کے موضوع اور اُن کے مخصوص اخلاقی نقطۂ نظر کے علاوہ ان کے زبان و بیان، ان کے الفاظ، تراکیب، ان کے استعارے اور تشبیہ اور ان کے رمز و کنایہ پر بھی اس تہذیب کا وہی اثر ہے اور اس طرح موضوع اور بیان میں بڑا خوش آئند ربط اور آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر بیتال پچیسی کے دو ایک ٹکڑے یہیں جگہ نقل کیے جاتے ہیں:

"ایک راجہ پرتاب مکٹ نام بنارس کا تھا اور اس کے بیٹے کا نام بجر مکٹ جس کی ناری کا نام جلوتی تھا۔ ایک دن کنور اپنے دیوان کے بیٹے کو ساتھ لے شکار کو گیا، اور بہت دُور جنگل میں جا نکلا اور اس کے بیچ ایک سُندر تالاب دیکھا کہ اُس کے کنارے ہنس، چکوا چکوی، بگلے، مرغابیاں سب کی سب کلول میں تھیں۔ چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے، کنول

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ... سنسکرت اور برج بھاشا کے علاوہ تامل، کناری، مراٹھی، گجراتی، بنگالی، تبتی، منگول، تلگو، فارسی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی، یونانی، سویڈش اور انگریزی۔ ان نسخوں کی مزید تفصیلات جن میں ان کا سنہ ترتیب و اشاعت اور مرتب کا نام بھی شامل ہے۔ "شمالی ہند کی اُردو نثری داستانیں" کے ضمیمہ نمبر ۳ میں موجود ہے۔

تالاب میں کھلے ہوئے۔ کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جن کی گھنی گھنی چھاؤں میں ٹھنڈی ہوا آتی تھی اور نیچے پکھیرو درختوں پر چہچہو میں تھے اور رنگ برنگ کے پھول بن میں پھول رہے تھے۔ اُن پر بھونروں کے جھنڈ کے جھنڈ گونج رہے تھے کہ اس تالاب کے کنارے پہنچے ...."

"چنچل چت کا، کالے سانپ کا، شتر و ناری کا بسواس نہ کیجیے۔ تریا چرتر سے ڈریے۔ کبیشر کیا نہیں کر سکتا اور جوگی کیا کچھ نہیں جانتا، متوالا کیا کچھ نہیں پہچانتا۔ رنڈی کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ گھوڑوں کا عیب، بادل کا گرجنا، تریا چرتر اور پُرش کا بھاگ یہ دیوتا بھی نہیں جانتے آدمی کا کیا مقدور ہے۔"

"جوگی نے کہا "سنسار میں جو کچھ بڑھا ہے اور سب گھٹ گیا۔ لوگ منہ پر بات میٹھی کرتے ہیں اور پیٹ میں کپٹ رکھتے ہیں۔ دھرم جاتا رہا۔ پاپ بڑھا۔ پرتھوی پھل کم دینے لگی۔ راجہ ونڈ دینے لگے۔ برہمن لالچی ہوئے۔ استریوں نے لاج چھوڑ دی۔ بیٹا باپ کی آگیا نہیں مانتا۔ تروں سے ترائی جاتی رہی۔ خاوندوں سے وفا اُٹھ گئی۔ سیوکوں نے سیوا چھوڑی۔ جتنی نالائق باتیں تھیں سب آگے آتی ہیں۔"

"رانی کا مکھ چندرماں سا، بال گھٹا سے، آنکھیں مرگ کی سی، بھوں دھنش سے، ناک تیر کی سی، گلا کبوتر کا سا، دانت انار کے سے دانے، ہونٹوں کی لالی کندوری کی سی، کمر چیتے کی سی، ہاتھ پاؤں کومل کنول سے، رنگ چنپا کا سا۔"

یہ مثالیں خالص ہندوستانی طرزِ فکر، اندازِ تخیل اور اسلوبِ نگارش کی مثالیں ہیں

اور بیتال پچیسی کا امتیاز ہیں، لیکن انھیں پڑھ کر ایک بات البتہ محسوس کی جا سکتی ہے کہ اس میں ہندی اور سنسکرت کے لفظوں کی کثرت ہے۔ فارسی اور عربی کے لفظ نسبتاً بہت کم ہیں اور ہندی اور سنسکرت کے لفظوں میں سے بہت سے غیر مانوس ہیں اس لیے بیتال پچیسی کی زبان اُردو کے روزمرہ سے بھی دُور ہو گئی ہے اور سلیس اور عام فہم بھی نہیں ــه

اتالیقِ ہندی: اتالیقِ ہندی ولا کی ایک اور ایسی تالیف ہے جس کی ترتیب میں کالج کے بعض اور اہلِ قلم بھی اُن کے شریک تھے۔ یہ کتاب ڈاکٹر گلکرسٹ نے اس غرض سے مرتب کروائی تھی کہ اس سے کالج کے طلبا کو فارسی پڑھنے میں آسانی ہو۔ کتاب اخلاقی اسباق اور کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

تاریخِ شیر شاہی: شہنشاہ اکبر نے عباس خاں بن شیخ علی سروانی سے شیر شاہ سوری کے عہد کی مکمل تاریخ فارسی میں لکھوائی تھی۔ کپتان جیمس ماؤنٹ نے اس کا ترجمہ ولاؔ کے سپرد کیا اور انھوں نے اسے ۱۸۰۵ء/۱۲۲۰ھ میں ختم کیا۔ لیکن یہ ترجمہ شائع نہیں ہو سکا۔ــئه ۱۸۶۵ء میں گارساں دتاسی نے اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا تھا۔ ولا کے ترجمہ کا قلمی نسخہ انڈیا آفس کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر نور کی وساطت سے صاحب

ــه "بیتال پچیسی" کے بارے میں مزید مطالعے کے لیے دیکھیے سید وقار عظیم ہی کی نگارشات:

i) بیتال پچیسی، ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۶ء

ii) ہماری داستانیں، اُردو مرکز، لاہور، طبع دوم ۱۹۶۴ء [مرتب]

ــئه منظر علی خاں ولاؔ کا یہ ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق کی ترتیب و حواشی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے: 'تاریخ شیر شاہی' از عباس خاں سروانی (ڈاکٹر سید معین الحق نے ان کا نام "عباس خاں سروانی" ہی بتایا ہے) مترجم: منظر علی خاں ولاؔ، ناشر: سلمان اکیڈمی حق منشان، ۳۰۔ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی، ۱۹۹۳ء، صفحات ۱۵۶۔ دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ "ترجمے کا جو نسخہ اس وقت شائع کیا جا رہا ہے خود مترجم (ولاؔ) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔" [مرتب]

اربابِ نثرِ اُردو کو اس کا جو نمونہ ملا ہے وہ ان کے حوالے سے درج ذیل ہے:

"اُس نے کہا 'اپنے بھائی میرداد کو شیر خاں کے پاس بھیجیے' وہ اس سے یہ قرار داد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں، لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اُس کی ناک اور کان کاٹے تا اوروں کو کان ہوں۔ جب میرداد شیر خاں کے پاس گیا اُس سے بہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاڈ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کروں گا اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجا لایا، کوئی فروگزاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت و اخلاص حد سے زیادہ کیا اور کہا کہ اگر لاڈ ملکہ میرے تین (تئیں) قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنونِ احسان ہوں گا۔ مرغِ دل کا شکار کرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے۔"

ترجمے کی عبارت میں گو روانی نہیں لیکن وہ سادہ اور عام فہم ہے اور تعقید و پیچیدگی سے خالی ہے۔

جہانگیر نامہ: گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق ولا نے تزکِ جہانگیری کے ایک حصے کا ترجمہ کیا تھا۔ دتاسی کے اس بیان کی تائید کسی اور نے نہیں کی اور نہ کہیں اس کا کوئی مطبوعہ یا قلمی نسخہ دستیاب ہوا۔ــئه اس لیے اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔

مجموعی حیثیت سے ولاؔ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو طرزِ بیان کے لحاظ سے اُن کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے مختلف کتابوں میں موضوع اور ماحول کی مطابقت اور مناسبت سے اپنے اندازِ تحریر میں تغیر کر لیا ہے اور ہر موقعے پر اپنے بیان کو اصل کے مطابق بھی رکھا ہے اور زبان کو اُلجھن اور پیچیدگی سے بھی محفوظ رکھا ہے۔

ــئه ولاؔ کے اس ترجمے کا نام "جہاں گیر شاہی" ہے۔ یہ فارسی تاریخ 'اقبال نامۂ جہانگیری' کا ترجمہ ہے جو ۲۱۔ جولائی ۱۸۰۹ء کو اختتام و انصرام کو پہنچا۔ اس کا ۳۹۳ اوراق کو محیط خستہ و کرم خوردہ قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی میں محفوظ ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، صفحہ ۵۲۴ تا ۵۳۰ [مرتب]

مرزا کاظم علی جوان :

مرزا کاظم علی جوانؔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی میں انہوں نے بھی ترکِ وطن کیا اور جگہ جگہ ہوتے ہوئے بالآخر لکھنؤ پہنچے[۱]۔ وہاں اُن دنوں شعر و شاعری کی محفلیں گرم تھیں۔ یہ بھی اُن میں شریک ہونے لگے اور مشاعروں میں غزلیں پڑھ کر تھوڑے ہی دنوں میں خاصی شہرت حاصل کر لی۔ اس بات کا علم نہیں کہ شاعری میں کس کے شاگرد تھے۔

کسی تذکرے سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ دہلی سے لکھنؤ کب آئے لیکن 'تذکرہ گلزارِ ابراہیم' اور تذکرہ طبقات الشعرا کے بیان کے مطابق وہ ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء اور ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء میں لکھنؤ میں موجود تھے۔ کاظم علی خاں عربی و فارسی کے علاوہ برج بھاشا بھی اچھی طرح جانتے تھے اور اپنے تبحرِ علمی کی وجہ سے معروف و مشہور تھے۔ اس لیے ۱۸۰۰ء میں لکھنؤ کے ریذیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے میر شیر علی افسوسؔ کی طرح اُنھیں بھی فورٹ ولیم کالج

---

[۱] مرزا کاظم علی جوان اور ان کی تصنیفات کے احوال میں مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے:
فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات' ڈاکٹر عبیدہ بیگم، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء
صفحات ۱۴۶-۱۵۱، ۲۴۸-۲۶۳ اور صفحہ ۵۶۵ تا ۵۷۶ [مرتب]

میں ملازمت دلوادی۔ ۱۸۰۱ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے کالیداس کے مشہور ڈرامے شکنتلا[۱] کو (جس کا ترجمہ نواز کبیشر نے برج بھاشا میں کیا تھا) برج بھاشا سے اُردو میں منتقل کیا۔ اس کام میں للو لال جی ان کے شریک تھے۔ دیباچے کے ترجمے میں کاظم علی لکھتے ہیں:

"دوسرے ہی دن اُنھوں (ڈاکٹر گلگرسٹ) نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکونتولا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر اور للو لال جی کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھایا کرے۔ اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی، لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سُنا پسند کیا اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاق سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ ۱۸۰۴ء ہیں اور راقم قرآن شریف کے ہندی ترجمہ کا محاورہ درست کرتا ہے، صاحب ممدوح نے فرمایا ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو چھپوادیں، نظر ثانی لازم ہے، اور کُب کو فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہو نہ رہے۔ چنانچہ ہم کو اُن فرمانا بجالائے"

کلکتہ کے بعد اس کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا ایڈیشن لندن (۱۸۲۶) ممبئی (۱۸۴۸ء) اور لکھنؤ (۱۸۷۵ء) سے شائع ہوا[۲]۔ اس کے تیسرے ایڈیشن کا ایک اقتباس اربابِ نثرِ اُردو میں چھپا ہے اس کا ایک ٹکڑا نمونے کے لیے درج ذیل ہے:

اگلے زمانے میں وسوامتر نام ایک شخص تھا۔ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں رہا کرتا

---

[۱] ایک حالیہ اشاعت: "سکنتلا" کاظم علی جوان، مجلس ترقی ادب لاہور، دسمبر ۱۹۶۳ء
مقدمہ، ڈاکٹر محمد اسلم قریشی، کچھ مصنف کے بارے میں ص ۳-۳۰
کچھ کتاب کے بارے میں ص ۳۱-۵۳
شکنتلا کے اصل سنسکرت نسخے سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے براہِ راست اُردو میں ایک ترجمہ کیا ہے، اور شکنتلا اس کا نام رکھا ہے، مطبوعہ اُردو اکیڈمی، سندھ، کراچی [مرتب]

[۲] شکنتلا کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ملا جسے اُنھوں نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا۔ ناشر: اُردو دنیا، کراچی ۱۹۶۴ء، صفحات ۱۱۰ [مرتب]

اور اپنے طور کی عبادت و ریاضت دن رات کیا کرتا۔ اپنے صاحب کی بندگی میں تن بدن کی کچھ اسے خبر نہ تھی۔ سوا اُنھی کے تصور کے کبھی نگاہ اِدھر اُدھر نہ کی تھی۔ یہاں تک دُبلاپے سے لگا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا ؎

بدن سوکھ کر اُس کا کانٹا ہوا تھا   ریاضت کے مارے وہ جیتا مُوا تھا

ان دکھوں سے اُس کو کبھی ایک دم آرام نہ تھا۔ سوا اُٹھانے ان جفاؤں کے کچھ کام نہ تھا تاکہ اس خاکساری سے دل کی آرزو بر آوے اور درخت سے مدعا کے پھل پاوے۔ ایسا جوگ کیا، ایسا آسن بیٹھا، نزدیک تھا کہ بندگی کے زور سے راجہ اندر کی سنگھاسن چھین لے۔ جتنے تیرتھ تھے اُن سب میں گیا۔ شہر شہر دریا دریا گھاٹ گھاٹ پھیرا کرتا پھرا۔ نہ چھوڑا کسی ندی کا کنارا۔ جس جنگل میں کسی درخت تلے ذرا بیٹھتا گردا گرد آگ جلاتا۔ پھر اپنے تئیں اُلٹا لٹکا دم بدم دھواں منہ میں لیا کرتا۔ تپشیا اس طرح کیا کرتا۔ غرض اس تپسوی کا یہی حال تھا، آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا۔ چونسٹھ برس تلک وہ بیاباں نورد تھا، سر سے لگا کر پاؤں تلک گرد گرد تھا۔ بناس پتی کھاتا رہتا، بھوک پیاس کی ایذائیں سہتا اور رُو بہ آفتاب ہو کر ؎

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ   بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر

اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں ہو کر کھڑا   جپ کیا کرتا تھا شوقِ دل سے ہر شام و سحر

اس عبارت کی خوبی یہ ہے کہ گو زمانے کے مذاق کے مطابق وہ مقفّٰی ہے لیکن قافیے کی پابندی نے روانی و سلاست میں فرق نہیں آنے دیا۔ عبارت کا دوسرا حُسن یہ ہے کہ مترجم نے خالص ہندوستانی اور ہندووانی معاشرت کی کہانی میں بھی فارسی عربی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کیے ہیں اور الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ اس سے کہانی کی صحیح مقامی فضا اور رنگ میں کوئی کمی نہیں آتی۔ فارسی عربی لفظوں کے بیچ بیچ میں ہندی کے الفاظ پوری بے تکلفی سے برتے گئے ہیں۔ عبارت میں اشعار کا

استعمال بھی برمحل اور برجستہ ہے اور اس سے عبارت کی روانی میں خلل پیدا ہونے کے بجائے اس کے اثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ عبارت مجموعی حیثیت سے اُردو روزمرّہ اور محاورے کے مطابق ہے۔ لطف، افسوس اور حسینی کی بے مزہ عبارت کے مقابلے میں اس میں انشا کا لطف بھی موجود ہے۔ شکنتلا کے علاوہ کاظم علی نے ایک 'بارہ ماسہ'[1] بھی لکھا۔ اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا حال مثنوی کے پیرائے میں نظم کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۰۳ء میں لکھا گیا اور ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے چھپا۔

۱۸۰۹ء میں جوانؔ نے تاریخِ فرشتہ کے اُس حصے کا، جو سلاطینِ بہمنی سے متعلق ہے، ترجمہ کیا تھا۔ لیکن یہ بھی اب نایاب ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ چھپا تھا کہ نہیں۔

کالج کی طرف سے دلّی، میر، سودا اور سوزؔ کے دیوانوں کے انتخاب بھی چھپے تھے کلیاتِ میرؔ کا انتخاب جوانؔ نے مولوی محمد اسلم، منشی غلام قادر اور مرزا جان طپش کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ کلیاتِ سوداؔ کا انتخاب بھی کاظم علی جوان اور بشیر علی افسوس نے مل کر کیا تھا۔ یہ دونوں انتخاب علی الترتیب ۱۸۱۱ء اور ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے شائع

---

[1] کاظم علی جوان نے گلکرسٹ کی فرمائش پر جو بارہ ماسہ نظم کیا، اس کا نام انھوں نے 'دستورِ ہند' رکھا۔ ۱۸۱۲ء کے مطبوعہ ایڈیشن کے سرورق کے مطابق یہ بارہ ماسہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۸۱۲ء میں ہندوستانی پریس (کلکتے) سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اپنی قابلِ قدر کتاب 'فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات' میں اس کا تعارف کرایا ہے (صفحہ ۵۶۵-۵۷۲) وہ لکھتی ہیں کہ "جوان کا بارہ ماسہ 'دستورِ ہند' بارہ ماسہ کم اور دستورِ ہند زیادہ ہے۔ دراصل ڈاکٹر گلکرسٹ کو بارہ ماسہ کی روایتوں اور اجزائے ترکیبی کا نہ تو علم تھا، اور نہ ہی ضرورت تھی۔ انھیں تو کسی ایسی نظم کی ضرورت تھی جس سے ہندوستان کے مختلف تہواروں، میلوں، ٹھیلوں اور رسم و عقائد سے متعلق معلومات فراہم ہو سکے۔ اُن کی اپنی پالیسی کے مطابق فورٹ ولیم کالج کے طالب علموں کو ان تمام باتوں کا علم ہونا ضروری تھا چنانچہ جوانؔ نے (گلکرسٹ کے حکم کے بموجب) اپنے بارہ ماسہ "دستورِ ہند" میں ہندوستان کے موسموں، فصلوں، مہینوں، رسم و رواج، کھیل تماشوں اور ہندو مسلمانوں کے تہواروں، ان کے مذہبی عقائد اور توہمات کو اس طرح نظم کیا ہے کہ یہ بارہ ماسہ ایک تہذیبی دستاویز کی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔" [مُرتّب]

ہوئے۔ یہ دونوں انتخاب بڑے اچھے ہیں اور انتخاب کرنے والوں کے حسنِ ذوق پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے کے بعد میرؔ و سوداؔ کے کلام کی اہم خصوصیات پڑھنے والے کے سامنے آجاتی ہیں۔

۱۸۰۵ء میں جوان نے للولال کوی کو "سنگھاسن بتیسی" کی ترتیب و ترجمہ میں بھی مدد دی تھی۔ ۱۸۱۵ء میں انھوں نے کپتان ٹامس روبک کے کہنے سے حفیظ الدین کی "خرد افروز" کی نظرِ ثانی بھی کی۔

شیخ حفیظ الدین احمد:

شیخ حفیظ الدین احمد کے خاندان کے ایک بزرگ عرب سے ترکِ وطن کرکے ہندوستان آئے اور دکن کو اپنا وطن بنایا۔ دو تین پشتوں کے بعد ان کے پرداد شیخ حسن دکن سے بنگال چلے گئے اور اسی کو وطن بنالیا۔ شیخ حفیظ الدین کے خاندان نے کئی نسلوں تک درویشی و فقر اور رشد و ہدایت کو اپنا مسلک رکھا۔ ان کے والد شیخ بلال الدین پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملازمت کو پیشہ بنایا اور وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل ہند کے قائم کیے ہوئے مدرسہ نیٹو کالج کلکتہ میں مدرس ہوئے۔ شیخ بلال الدین عربی فارسی کے متبحر عالم تھے۔ شیخ حفیظ الدین نے عربی فارسی اُن سے سیکھی اور نشنٹہ کالج میں عربی فارسی پڑھی اور بیس سال کی عمر فارغ التحصیل ہوئے جب فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو انھیں عربی فارسی کا مدرس مقرر کیا گیا[1]

---

[1] شیخ حفیظ الدین کے بعض حالات زندگی کے سلسلے میں تھوڑا سا اختلاف رائے ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب اور صاحب سیر المصنفین کا خیال ہے کہ حفیظ الدین دہلی کے ریذیڈنٹ کے منشی تھے اور پھر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے ان دونوں کے نزدیک ان کا وطن دہلی ہے لیکن مندرجہ بالا حالات خود حفیظ الدین احمد کی تالیفات اور معاصر تذکرہ نویسوں (جن میں تذکرہ طبقات الشعرا سب سے اہم ہے) سے ماخوذ ہیں اس لیے زیادہ قرینِ قیاس ہیں۔ صاحب تذکرہ طبقات الشعرا نے ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین احمد کی دہلی میں موجودگی کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ ۱۸۱۵ء میں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہو کر دہلی کے ریذیڈنٹ مسٹر مٹکاف کے میر منشی مقرر ہوگئے تھے۔

درس و تدریس کے کام کے علاوہ کالج میں حفیظ الدین احمد سے ترجمہ و تالیف کا کام بھی لیا گیا اور ۱۸۰۳ء میں انہوں نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر ابوالفضل کی عیارِ دانش[1] کا ترجمہ اردو میں کیا اور 'خرد افروز' نام رکھا[2]۔ یہ ترجمہ عبارت کی سادگی، صفائی اور شستگی کی بنا پر بہت پسند کیا گیا۔ ترجمے میں حفیظ الدین احمد نے اپنے خیالات کو اصل کی حد میں رکھتے ہوئے بھی قواعد و محاورے کی پابندی کی ہے اور قواعد و محاورے کی پابندی کر کے بھی سلاست و روانی کو برقرار رکھا ہے۔ عبارت میں ہندی، فارسی اور عربی الفاظ کا بڑا صحیح امتزاج ہے ۱۸۰۵ء میں یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی اور دوسری بار کپتان ٹامس روبک نے میر کاظم علی جوان، منشی غلام اکبر، مرزائی بیگ اور منشی غلام قادر کی نظرِ ثانی و

---

[1] عیارِ دانش میں کلیلہ دمنہ کا قصہ ہے جس کی اصل سنسکرت ہے۔ سنسکرت سے فارسی تک پہنچنے میں اس قصے نے کئی مرحلے طے کیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کلیلہ دمنہ کہانیوں کے اُن سنسکرت ذخیروں سے ماخوذ ہے جو پنچ تنتر، ہتوپدیش اور کتھا سرت ساگر کے نام سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نوشیرواں کے حکم سے چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں (اندازاً ۵۵۰ء) حکیم برزویہ ہندوستان جا کر یہ قصہ لایا اور اسے پہلوی زبان میں لکھا۔ بعض بیانوں کے مطابق پہلوی کا ترجمہ بزرجمہر نے کیا ہے۔ ۷۵۰ء عبداللہ ابن المقفع نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ ۱۱۲۱ء میں نصر اللہ نامی ایک شخص نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا حسین بن علی واعظ کاشفی نے نصر اللہ اور مقفع دونوں سے استفادہ کر کے انوارِ سہیلی لکھی۔ کلیلہ دمنہ کے سلسلے کی یہ سب سے مشہور کتاب ہے۔ اس کا سنہ تالیف و ترتیب ۱۴۷۰ء اور ۱۵۰۵ء کے درمیان ہے۔ انوارِ سہیلی میں عربی الفاظ کی کثرت تھی اس لیے ابوالفضل نے انوارِ سہیلی کو مختصر اور آسان کر کے عیارِ دانش لکھی۔ حفیظ الدین کی کتاب اسی عیارِ دانش کا ترجمہ ہے۔ کلیلہ دمنہ کی اصل اور ماخذ کے متعلق اور دوسری زبانوں میں اس کے نثر و نظم کے ترجموں کی تفصیل کے لیے 'شمالی ہند کی اردو نثر کی داستانیں' کا دوسرا اور چھٹا باب اور کتاب کا ضمیمہ ۳ دیکھا جا سکتا ہے

[2] ۱۸۰۳ء کے متن پر مبنی 'خرد افروز' کی ایک تازہ اشاعت یہ ہے:

(۱) خرد افروز، حفیظ الدین احمد، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، اگست ۱۹۶۳ء۔ مقدمہ سید عابد علی عابد صفحہ ۱-۸

(۲) خرد افروز (جلد دوم)، حفیظ الدین احمد، مرتبہ مشتاق حسین، مجلس ترقی ادب لاہور، دسمبر ۱۹۶۵ء

حرفِ آغاز: امتیاز علی تاج [مرتب]

تصحیح کے بعد ۱۸۱۵ء میں شائع کی[1]۔ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ وِک نے اس کا ایک بہت اچھا ایڈیشن شائع کیا۔ اس نسخہ میں رسم الخط اور املا کے اہتمام کے علاوہ مفید حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ 'خرد افروز' کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا ہے۔ 'خرد افروز' کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"نقل ہے کہ روم کی سرحد میں ایک بادشاہ، عالی ہمت، بزرگ منش تھا۔ اس کے دو بیٹے حسین و خوش خو تھے۔ جب بادشاہ نے عالم بقا کے کوچ کا نقارہ بجایا بڑا بھائی دولتِ بادشاہی بہ جبر لے کر چھوٹے بڑے سبھوں کے دل کو ہاتھ میں لایا اور باپ کے تختِ شاہی پہ بیٹھا اور خزانہ کا منہ کھول دیا۔ چھوٹے بھائی نے اس ڈر سے کہ مبادا مجھ پر کچھ آفت لاوے وطن چھوڑ کر سفر اختیار کیا اور اکیلا راہِ دور و دراز کو چلا۔ اتفاقاً ایک جوان نازنین، خوبصورت کہ جس نے زمانہ کی گردش سے سفر کیا تھا اس کے ہمراہ ہوا۔ شہزادے نے جو اس کے چہرے سے راست بازی دریافت کی اس کی رفاقت سے خوش ہوا۔ دوسری منزل میں ایک دانا سوداگر بچہ، ہوشیار کہ جس نے گھر بار تج کر سفر کیا تھا، اُن کو ملا۔ تیسری منزل میں ایک زور آور دہقان بچہ جو کسی باغبانِ دانا کے نطفہ سے تھا اُن کا رفیق ہوا۔ تمام اذیت سفر کی راحت سے بدل ہوئی۔ چاروں دوست ایک دل، خوشی سے منزل طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے۔"[2]

(خرد افروز مطبوعہ ۱۸۵۷ء)

---

[1] ۱۸۱۵ء میں لندن سے 'خرد افروز' کا جو نسخہ شائع ہوا، اُس پر کپتان ٹی۔ روبک نے انگریزی میں ایک دیباچہ کا اضافہ کیا۔ اس دیباچے کا اردو ترجمہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کیا ہے اور یہ 'خرد افروز' (مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء) کے آخر میں (ص ۲۰۹-۲۱۲) شامل ہے۔ [مرتب]

[2] بحوالہ اربابِ نثرِ اردو، صفحات ۲۱۳-۲۱۴

اس کتاب کی پسندیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حفیظ الدین احمد[1] کے ترجمے کے بعد اردو میں اس کے کئی ترجمے ہوئے ان میں سب سے مشہور اور ادبی حیثیت سے سب سے زیادہ پسندیدہ فقیر محمد خاں گویا کا کیا ہوا ترجمہ 'بستانِ حکمت' ہے جو ۱۸۳۶ء میں شائع ہوا۔[2]

---

[1] شیخ حفیظ الدین احمد کے احوال اور 'خرد افروز' کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۱۹۶-۱۹۷ اور ص ۳۴۹ تا ۳۵۷ [مرتب]

[2] اردو کے دوسرے ترجموں کی تفصیل کے لیے ڈاکٹر گیان چند کی کتاب "شمالی ہند کی اردو نثری داستانیں" کا ضمیمہ ۳ دیکھا جا سکتا ہے۔ [مرتب]

خلیل علی خاں اشک:

فورٹ ولیم کالج کے اربابِ قلم میں صرف اشک ایسے ہیں جن کے نام اور تخلص کے سوا اُن کا ذرا سا حال بھی کہیں نہیں ملتا۔[1] یہ بات البتہ معلوم ہے کہ وہ چار کتابوں کے مؤلف ہیں۔ ان چار کتابوں میں سب سے زیادہ معروف و مقبول اُن کی تالیف داستان امیر حمزہ ہے۔[2] باقی تین کتابوں کے نام اکبر نامہ، قصۂ گلزارِ چین اور رسالۂ کائنات ہیں۔ داستان امیر حمزہ کے ماخذ اور تالیف کے متعلق اشک نے کتاب کے دیباچے میں یہ عبارت لکھی ہے:

"بنیاد اس قصۂ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت میں ہے۔

---

[1] اشک نے 'انتخابِ سلطانیہ' کے دیباچے میں اپنے سوانحی حالات بڑی تفصیل سے درج کیے ہیں' دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات" ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۱۶۱-۱۶۵ [مرتب]

[2] داستانِ امیر حمزہ کے بارے میں بعض اہم ماخذ:

(i) اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ" ۱۹۶۲ء (غیر مطبوعہ) سید محمود نقوی (ڈاکٹر سہیل بخاری) ص ۸۹-۹۵

(ii) اردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند، طبع دوم ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۰-۱۶۲ ص ۴۷۱-۵۹۷، ص ۷۱۸-۷۲۰

(iii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۳۰۰-۳۰۸ [مرتب]

اس زمانے میں جہاں تک راویانِ شیریں کلام تھے، اُنھوں نے آپس
میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری
اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے، امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی
چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں۔ ہر رات کو ایک داستان حضور میں سُناتے
تھے، انعام و اکرام پاتے تھے۔ اب شاہِ عالی جاہ عالم بادشاہ کے
عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک
عیسوی کے، خلیل علی خاں نے جو متخلص بہ اشک ہے، حسبِ خواہش
مسٹر گلکرسٹ صاحب عالی شان والا مناقب بنا بر آموزانِ زبان ہندی
اس قصہ کو اُردوئے معلیٰ میں لکھا تاکہ صاحبانِ مبتدیاں کے پڑھنے کو
آسان ہووے۔"

اس دیباچے سے ظاہر ہے کہ اشک نے کسی خاص کتاب کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ امیر حمزہ کے متداول قصے کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ اشک کی یہ داستان امیر حمزہ فورٹ ولیم کالج کے قصوں میں سب سے طویل ہے اور اس کی ضخامت "باغ و بہار" اور "آرائشِ محفل" سے کئی گنی ہے۔ کتاب کے چار حصے ہیں لیکن چونکہ ان سب حصوں کے کردار ایک سے ہیں اس لیے ان چاروں حصوں میں قصے کے اعتبار سے ربط و تسلسل ہے جس طرح دوسرے داستان گو اپنے اصل قصے کے ساتھ دوسرے ضمنی قصے شامل کر کے داستان کو طول دیتے ہیں، داستانِ امیر حمزہ میں یہ بات نہیں۔ اس کی طوالت اول تو قصے کے اجزا کی کثرت کی بنا پر ہے، دوسرے اس لیے کہ اس میں ہر جگہ واقعہ نگاری پر زور دیا گیا ہے اور رزم و بزم کی مرقع کشی میں مؤلف نے اپنے مشاہدے کی قوت اور تخیل کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ اشک کے طویل قصے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے قصوں کی طرح اس میں بھی مقامی معاشرت کا رنگ کثرت سے شامل کیا گیا ہے۔ گو قصے میں فارسی الاصل ہونے کی بنا پر زیادہ باتیں ایسی ہیں جن پر ایرانی زندگی کا رنگ طاری ہے اور فارسی طرزِ فکر و تخیل

جاری و ساری ہے لیکن اشک نے اس کی تفصیلات میں بہت سے اضافے کیے ہیں اور اس طرح ان کا قصہ جا بجا ہندوستانی زندگی اور ہندوستانی مزاج کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ کرداروں کے گفتار و رفتار پر بھی ہندی معاشرت کا گہرا عکس ہے۔ وہ عرب اور ایرانی ہونے کے باوجود اپنی بہت سی باتوں میں ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کی بنا پر اشک کی داستانِ امیر حمزہ کو تالیف کے بجائے تصنیف کا درجہ دیا جاتا ہے [15]

داستانِ امیر حمزہ کی زبان بہت صاف، سلیس اور طویل قصے کے بیان کے لیے بے حد موزوں ہے۔ اشک نے جا بجا، مناسب موقعوں پر عبارت میں قافیے اور سجع سے بھی کام لیا ہے اور سیدھی سادی باتوں کو ادبی اور شاعرانہ انداز میں بیان کر کے اُس کی دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ اشک کی رنگینی میں ایک طرح کی سادگی ہے، جس کی کمی پڑھنے والے اُس داستان امیر حمزہ میں شدت سے محسوس ہوتی ہے جو ۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۷ء میں سید عبداللہ بلگرامی اور تصدق حسین کی ترمیم و اضافے کے بعد لکھنؤ میں چھپی۔

کپتان ولیم ٹیلر کی فرمائش پر اشک نے ۱۸۰۹ء ابوالفضل کے اکبر نامہ کا ترجمہ کیا اور اس کا نام واقعاتِ اکبر رکھا۔ یہ کتاب نہ شائع ہوئی اور نہ اس وقت تک کسی کتب خانے میں اس کے وجود کا پتہ چلا ہے۔ [16]

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانے میں نصیر الدین ہاشمی صاحب (مؤلف دکن میں اُردو) کو اشک کی دو کتابیں اور ملیں۔ ایک گلزارِ چین [17] اور دوسری رسالۂ کائنات۔

---

[15] اشک کی داستان امیر حمزہ کو لکھنؤ کے بعض معروف داستان گویوں نے ترمیم و اضافے کے بعد شائع کیا ہے اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی لیکن قاری کی دلچسپی کے لیے اس کی توجہ "ہماری داستانیں" وقار عظیم کے اُس مضمون کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جس میں داستانِ امیر حمزہ کے اشک والے نسخے اور لکھنؤ کے ترمیم شدہ ایڈیشن کے فرق کی وضاحت کی گئی ہے۔

[16] "واقعاتِ اکبر" غیر مطبوعہ ہے، ۴۸۱ صفحات کو محیط اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں موجود ہے تفصیل کے لیے رجوع کیجیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۵۱۹-۵۲۳ (مرتب)

[17] اس بیان کی تائید بیلی کی کتاب "مختصر تاریخ اُردو" سے بھی ہوتی ہے۔

پہلی کتاب "گلزارِ چین" اشک نے ۱۸۰۴ء میں ہنری بوٹ کے کہنے سے مرتب کی تھی۔ یہ فارسی کے ایک مشہور قصے کا ترجمہ ہے اور اس میں شہزادہ رضوان شاہ اور جنوں کے بادشاہ کی لڑکی روح افزا کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"بلادِ چین میں ایک بادشاہ عادل و بایزل، رعیت پرور، غریب نواز، داوگستر ایسا تھا کہ اقلیم سبع آفتاب مہتاب کی شکل اس کے فیض سخاوت و عدالت سے روشن تھی۔ جناب باری نے اُسے ہر ملک کی شہریاری دی تھی۔ روز و شب عیش و عشرت میں رہتا تھا۔ اس کے شہر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا۔ بادشاہ کو سوا ایک غمِ فرزند رہتا تھا۔ اس کے گھر میں اولاد نہ تھی۔" [1]

اُن کی چوتھی تالیف رسالہ کائنات، ایک مختصر رسالہ ہے جو ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر مرتب ہوا تھا۔ اس کی عبارت کا نمونہ موجود نہیں [2]۔

---

[1] "گلزارِ چین" کو قصہ رضوان شاہ" اور نگارخانۂ چین" بھی کہا گیا ہے۔ یہ قصہ اپنے زمانے میں شائع نہیں ہو سکا۔ اس کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں محفوظ ہے رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن کے جس قلمی نسخے کی نشاندہی نصیر الدین ہاشمی نے کی تھی اُسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں بھی محفوظ ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے:

فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، ص ۳۰۹-۳۱۶ [مرتب]

[2] اب رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن کے قلمی نسخے کو ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ (مطبوعہ اُردو دنیا، کراچی ۱۹۶۵ء) ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے بھی اپنے قابلِ تحقیقی مقالے میں رسالۂ کائنات کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۵۰۶-۵۰۹) ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے خلیل علی خاں اشک کی دو غیر مطبوعہ تالیفات "منتخب الفوائد" (۱۸۱۱ء) اور "انتخاب سلطانیہ" (۱۸۰۵ء) کا بھی لگایا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۴۵۴-۸۰ اور ص ۵۱۵-۵۱۸ علی الترتیب [مرتب]

للّولال کوی:

للولال کوی فورٹ ولیم کالج کے اُن اہلِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے گو خود اُردو میں کوئی تصنیف یا تالیف نہیں کی۔ لیکن کالج کے اُن اہلِ قلم کو جنہوں نے سنسکرت اور ہندی کی کتابیں اُردو میں منتقل کیں اُن کے کام میں بہت مدد دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندی میں جو کتابیں لکھیں اُن میں سے سنگھاسن بتیسی اتنی مقبول ہوئی کہ اُسے فارسی رسم الخط میں منتقل کر کے چھاپا گیا اور وہ اب بھی برابر اسی طرح چھپتی ہے جیسے اُردو کی دوسری پسندیدہ کتابیں۔ سنگھاسن بتیسی کی اصل بھی سنسکرت ہے اور اس میں بھی بیتال پچیسی کی طرح بتیس "۳۲" قصے ایک ہی طرح کے حالات میں بیان کیے گئے ہیں۔ قصہ یوں ہے کہ راجہ بھوج کے زمانے میں زمین میں سے ایک تخت نکلا۔ راجہ بھوج نے اس تخت پر بیٹھنے کی کوشش کی تو تخت کے آس پاس لگی ہوئی پتلیوں میں سے ایک پتلی بولی "اے راجا! یہ سنگھاسن (تخت) راجا بکرماجیت کا ہے۔ پہلے تو اپنے آپ میں اس کی سی خوبیاں پیدا کر پھر اس تخت پر بیٹھ"۔ یہ کہہ کر پتلی راجا بکرماجیت کی عظمتِ کردار کا کوئی قصہ سُناتی ہے۔ یہی صورت ۳۲ مرتبہ پیش آتی ہے۔ ہر مرتبہ راجہ بھوج تخت پر قدم رکھنا چاہتا ہے ایک پتلی اُسے ایسا کرنے سے روکتی ہے اور راجہ بکرماجیت کی زندگی کا کوئی واقعہ سُناتی ہے اور یوں ۳۲ کہانیاں پوری ہوتی ہیں۔

کتاب کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔

سنگھاسن بتیسی پہلے سنسکرت میں تھی۔ شاہجہاں کے درباری شاعر سندر داس کوی نے ۱۶۳۱ء کے آس پاس اس کا ترجمہ برج بھاشا میں کیا اور اسے للّو لال جی اور کاظم علی جوان نے ۱۸۰۴ء میں اٹھارویں صدی کی ہندی میں منتقل کیا اور یہ قصہ ۱۸۰۵ء میں فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں چھپا۔ سنگھاسن بتیسی کی دوسری کہانی میں بیتال پچیسی کی بنیادی کہانی اور اکیسویں کہانی میں مادھونل اور کام کندلا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں کی فضا اور ماحول اور پس منظر بھی بیتال پچیسی کی کہانیوں کی طرح خالص ہندوستانی ہے لیکن مجموعی حیثیت سے تخیل، فکر اور اسلوب کے لحاظ سے یہ مجموعہ بیتال پچیسی سے کمتر درجے کا ہے۔

سنگھاسن بتیسی کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"ایک دن دو شخص آپس میں جھگڑنے لگے۔ ایک نے کہا کرم بڑا، ایک نے کہا بل بڑا۔ قسمت کا طرف دار بولا "نصیب بڑا ہے، ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیتا ہے۔ زور کا جانبدار کہنے لگا کہ زور بڑا ہے۔ زور آور ہوئے تو تمام جہان کو زیر کر دے۔ اسی طرح دونوں جھگڑتے راجہ اندر کے پاس گئے۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "ہمارا نیاؤ کرو۔ جو دونوں میں سچ ہو اسے فرمائیے اور جھگڑا نبٹریے۔ تب راجہ اندر بولا "یہ ہم سے نہ ہوگا۔ اس انصاف کو وہ کرے گا جس نے جوگ کیا ہوگا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ تم مرت لوک میں راجہ بکرماجیت کے پاس جاؤ۔ اس نیاؤ کو وہ نچکا دے گا۔ اُنھوں نے راجہ اندر کی آگیا پاکر راجہ بکرماجیت کے پاس آئے۔ یہ ظاہر کیا کہ ہم تینوں سبھوں میں پھر آئے اور کسی نے نیاؤ نہیں نچکایا۔ اس کا دھرم ادھرم بچار نیاؤ کرو۔ یہ بات سن راجہ نے کہا: "آج تم اپنے گھر جاؤ۔ چھ مہینے کے بعد ہمارے پاس آنا تب ہم اس کا جواب دیں گے۔"

للّو لال جی ذات کے برہمن اور گجرات کے رہنے والے تھے[1]۔ لیکن بچپن ہی سے شمالی ہند میں آبسے تھے۔ سنسکرت، برج بھاشا اور دوسری پراکرتوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو یہ شروع ہی سے یہاں ملازم ہو گئے اور ہندی میں تصنیف و ترجمے کا خاصا کام کیا۔ انھوں نے سنگھاسن بتیسی کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں ہندی میں لکھیں[2]۔

پریم ساگر، راج نیتی، سبھا بلاس، مہادیو بلاس اور لطائف ہندی۔

پریم ساگر بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔

راج نیتی میں قصے کہانیوں کے انداز میں اصولِ اخلاق اور طرزِ حکومت کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں۔

مہادیو بلاس عشق و محبت کی ایک منظوم داستان ہے۔

لطائف ہندی ہندوستانی لطیفوں اور مزاحیہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ۱۸۱۰ء میں فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں شائع ہوا تھا۔

سبھا بلاس ہندی کا منتخب نظموں کا مجموعہ ہے کے ہندی طالب علموں کے لیے مرتب کیا گیا اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا[3]۔

---

[1] للّو لال جی کوی کے احوال میں قیمتی معلومات کے لیے دیکھیے:
فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، عبیدہ بیگم، ص ۱۵۲-۱۵۶ [مرتب]

[2] للّو لال جی کوی کی کتابوں کی تفصیلات کے بارے میں ملاحظہ کیجیے:
فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم ص ۴۷۰-۴۸۰،
ص ۵۶۳-۵۶۵، ۶۰۳-۶۰۴، ۶۲۸ اور ۶۳۱-۶۳۴ [مرتب]

[3] "سبھا بلاس" کا سنہ طباعت سید محمد (ارباب نثر اردو) نے ۱۸۱۰ء درج کیا ہے جو درست نہیں، 'سبھا بلاس' ۱۸۱۵ء میں چھپی تفصیل کے لیے دیکھیے:
فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات (ڈاکٹر عبیدہ بیگم)، ص ۶۰۳-۶۰۴ [مرتب]

نہال چند لاہوری :

نہال چند لاہوری کے آبا و اجداد کا وطن دہلی تھا، لیکن دہلی کی تباہی نے نہال چند کو لاہور چلے جانے پر مجبور کیا۔ وہاں جا کر رہے اور لاہوری کہلائے۔ ایک انگریز کپتان ولورٹ کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے[۱] اور گل بکاؤلی کے قصّے کو فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور مذہبِ عشق نام رکھا۔ یہ قصّہ فارسی میں عزت اللہ بنگالی نے ۱۷۲۲ء/۱۱۳۴ھ میں فارسی میں لکھا تھا۔ مذہبِ عشق اسی قصے کا ترجمہ ہے۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۳ء ہے[۲]۔ کتاب پہلی مرتبہ کلکتہ سے ۱۸۰۴ء میں چھپی۔ اس کے بعد مختلف مطابع سے اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔[۴] اس قصے کی

---

[۱] نہال چند، شعبۂ ہندوستانی (فورٹ ولیم کالج) کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے (دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۲۱۱) گلکرسٹ نے اگست ۱۸۰۳ء کے ایک نوٹ میں نہال چند (مصنف گل بکاؤلی/مذہبِ عشق) کا ذکر اُن مصنفین کے تحت کیا ہے جو فورٹ ولیم کالج کے باتنخواہ ملازم نہیں تھے:

گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع اوّل ۱۹۶۰ء ص ۱۴۲، طبع دوم ۱۹۷۹ء ص ۱۳۹ [مرتب]

[۲] گل بکاؤلی کے قصے کے بارے میں ایک اہم حوالے کے لیے دیکھیے:

"قصہ گل بکاؤلی کے تاریخی مباحث و مآخذ پر ایک نظر" ڈاکٹر فرمان فتح پوری

صحیفہ لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۱ - ۵۸ [مرتب]

[۳] تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے ع کہ ہے "مذہبِ عشق" تاریخ و نام

[۴] LINGUASTIC SURVEY OF INDIA کی جلد نہم میں دیکھی جا سکتی ہے

مقبولیت کو دیکھ کر پنڈت دیا شنکر نسیم نے اسے ۱۸۳۸ء میں نظم کیا اور گلزارِ نسیم نام رکھا۔[۱]

مذہبِ عشق میں ۲۹ باب (یا داستانیں ہیں) - ان ابواب میں سے ہر ایک میں قصے کے مختلف اجزا بیان ہوئے ہیں، گو ان سب میں آپس میں ربط و تسلسل ہے۔ فارسی قصہ بڑی پر تکلف اور پیچیدہ عبارت میں لکھا گیا ہے۔ اس میں ہر جگہ لفاظی سے کام لیا گیا ہے اور لفاظی اور عبارت آرائی پر زورِ قلم صرف ہوا ہے۔ مترجم نے اپنے ترجمے کو اصل سے زیادہ سے زیادہ قریب رکھتے ہوئے بھی ان تکلفات سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے لفاظی کی جگہ سادگی اختیار کر کے قصّے کو عام فہم بنا دیا ہے اور قصہ پڑھنے والا عبارت کے تکلفات میں اُلجھے بغیر قصے سے محظوظ ہوتا ہے۔ کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"اس نے کہا کہ آج تم یہ گٹھے میرے آقا کے باورچی خانے میں لے چلو، دولت خانہ اُس کا نزدیک ہے۔ اس نے اس ویرانے میں ایک شہر آباد کیا ہے، واجبی قیمت ملے گی، بلکہ ایسا انعام پاؤ گے کہ پھر کبھی اور لکڑیاں بیچنے نہ جاؤ گے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہماری تمام عمر اسی کام میں اور اسی بیابان سے لکڑیاں لے جاتے گزری ہے، لیکن آبادی کا یہاں نشان نہ دیکھا نہ سُنا۔ ساعد نے کہا "ذرا تم آگے بڑھ کر دیکھو اگر میرے کہنے کا کچھ اثر ظاہر ہو تو بہتر نہیں تو تمہارے پھر آنے کا کوئی مانع نہ ہوگا۔ لکڑہارے انعام کے لالچ سے ساعد کے آگے ہو لیے۔ پھر تھوڑی دور جا کر سب ایک بارگی پکار اُٹھے کہ نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ اے میاں تم ہمیں آگ میں جھونکنے کو لیے جاتے ہو، چولھے میں جائے انعام اور بھاڑ میں پڑے اکرام۔ بس ہمیں معاف کرو۔ ہم نے بھر پایا۔ ساعد نے کہا یہ شعلۂ آتش نہیں، حویلی کے جواہرات چمک رہے ہیں۔ تم

---

[۱] "گلزارِ نسیم" کے بارے میں ایک اچھے تنقیدی اور تحقیقی جائزے کے لیے دیکھیے: اُردو کی منظوم داستانیں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۱ء، ص ۵۸۱ - ۶۲۱ [مرتب]

ہرگز اندیشہ نہ کرو اور میرے ساتھ چلے آؤ: وہ اس کے کہنے سے کچھ اور بھی بڑھے۔ آگے ساری زمین سونے کی نظر آئی۔ سب نے اس کی بات سچی پائی، قدم اُٹھائے بے دھڑک چلے۔[۵]

---

[۵] "مذہبِ عشق" کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے:

(i) مذہبِ عشق، محمدی پریس، بمبئی ۱۳۶۸، ۱۹۴۸ء

(ii) مذہبِ عشق، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۶۱ء

(iii) اُردو کی نثری داستانیں، ڈاکٹر گیان چند، طبع دوم، کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۱ - ۲۲۳

(iv) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۲۳۳ - ۲۴۸ [مرتب]

بینی نرائن جہاں:

بینی نرائن جہاں کے حالات سوائے طبقات الشعرائے اُردو یا خود اُن کی تالیفات کے دیباچوں کے اور کہیں نہیں ملتے۔ ان حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ بینی نرائن لاہور کے باشندے تھے۔ ان کے والد راجا لکشمی نرائن[۱] بیاں کے رئیس اور ان کے بھائی رائے کھیم نرائن صاحبِ علم اور شاعر تھے رند تخلص کرتے تھے۔ بینی نرائن لاہور میں پیدا ہوئے[۲] اور یہیں تعلیم پائی۔ گردشِ زمانہ نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تو شہر در شہر ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر گلکرسٹ کالج چھوڑ چکے تھے اور کالج میں تصنیف و تالیف کے کام کا زور ختم ہو چکا تھا اس لیے انہیں فوراً یہاں ملازمت نہ ملی اور کئی برس عسرت و پریشانی میں بسر ہوئے۔ اس دوران میں اُن کا ربط ضبط کالج کے اربابِ قلم سے بڑھ گیا اور انھیں میں سے ایک (یعنی سید حیدر بخش حیدری) کی وساطت سے وہ کپتان ٹامس روبک تک پہنچے اور کالج کے

---

[۱] ان کے والد کا صحیح نام راجہ سودشٹ نرائن ہے۔ دیکھیے: اُردو کی قدیم داستانیں، ایم حبیب خاں، علی گڑھ، جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۸۹ [مرتب]

[۲] بینی نرائن جہاں کے بیشتر سوانح نگار انہیں لاہوری لکھتے ہیں۔ لیکن "باغِ عشق" کے دیباچے میں خود بینی نے اپنے آپ کو دلی کا رہنے والا کہا ہے اور اپنا مولد شاہ جہاں آباد (دہلی) بتایا ہے۔ بحوالہ: ایم حبیب خاں، اُردو کی قدیم داستانیں، ص ۸۹ - ۹۰ [مرتب]

ملحقہ مصنفین و مولفین میں شامل ہو گئے۔

کالج کی ملازمت[1] کے دوران میں انہوں نے دو کتابیں لکھیں۔ چار گلشن اور دیوانِ جہاں۔ گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق[2] انہوں نے شاہ رفیع الدین دہلوی کی فارسی کتاب[3] تنبیہ الغافلین کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

چار گلشن' جو زمانے[4] کی ترتیب کے لحاظ سے بینی نرائن کی پہلی تالیف ہے، ایک عشقیہ داستان ہے جس میں شاہ کیواں اور فرخندہ کی محبت کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں مولف نے لکھا ہے کہ اس کا پلاٹ ایک مدت سے اُن کے ذہن میں تھا۔ ایک مرتبہ (۱۸۱۰ء/۱۲۲۵ھ میں) انھوں نے یہ قصہ منشی امام بخش کو سنایا تو انہوں نے پسندیدگی کے بعد اسے نثر میں لکھنے کی تاکید کی۔ قصہ مکمل ہو گیا تو کپتان ٹامس روبک اور کپتان ولیم ٹیلر کو دکھایا گیا انھوں نے بھی اسے پسند کیا اور معاوضہ دے کر اسے کالج کے لیے خرید لیا۔ لیکن یہ قصہ چھپ نہیں سکا۔ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں البتہ محفوظ ہے۔ اس قصے کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"زمانۂ گزشتہ کے نقل کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں

---

[1] بینی نرائن کالج کے باضابطہ ملازم نہیں تھے، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۱۹۱-۱۹۳ [مرتب]

[2] خطبات گارساں دتاسی' خطبہ پانچواں صفحہ ۹۰-۹۱، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو

[3] مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی، مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے خلف الرشید تھے۔ شمالی ہند میں قرآن کے جتنے ترجمے ہوئے اُن میں سب سے پہلا شاہ صاحب موصوف کا ہے۔

[4] چار گلشن پر بینی نرائن کو ساٹھ روپے بطور انعام ملے تھے (لکشمی ساگر وارشنے' فورٹ ولیم کالج (ہندی)، ص ۱۰۴) ڈاکٹر عبادت بریلوی نے برٹش میوزیم' لندن کے نسخے کو اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا ہے (اُردو دنیا' کراچی ۱۹۶۷ء)۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس نسخے سے استفادہ کیا ہے۔ دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۳۳۹ - ۳۴۰۔

[مرتب]

نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتۂ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں میں ایک بادشاہ جم جاہ، نہایت عالی شان والا دودمان تھا۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانہ میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے رعب و داب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا، بیت:

فلک مرتبت تھا وہ کیواں شاہ　　　دو مشعل فروز اس کے تھے مہر و ماہ

ایک دن وہ بادشاہ قلعہ کے جھروکے میں بیٹھا ہوا دریا کی سیر کر رہا تھا بہت آدمی اپنے کاروبار میں مشغول ہو رہے تھے۔ گزارے کی کشتیاں آدمیوں سے بھری ہوئیں اُدھر سے ادھر اور ادھر سے اُدھر آتی جاتی تھیں" (چار گلشن قلمی نسخہ ص ۱۲)[1]

دیوانِ جہاں[2] اردو شاعروں کا تذکرہ ہے جو جہاں نے کپتان روبک کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اس کی تاریخ ترتیب ۱۸۱۴ء/۱۲۲۹ھ[3] ہے اور اس میں ۱۲۵ (کے قریب) شاعروں کا مختصر حال درج ہے۔ شعرا کے حالات میں عموماً اُن کا نام، ولدیت، وطن

---

[1] اربابِ نثرِ اُردو صفحہ ۲۵۳ بہ حوالہ ڈاکٹر محی الدین زور

[2] "دیوانِ جہاں" کو پروفیسر کلیم الدین احمد نے "کرنٹ اسٹڈیز" کے خاص نمبر کے طور پر ۱۹۵۹ء میں مطبع لیتھو پریس پٹنہ سے شائع کر دیا ہے۔ "دیوانِ جہاں" کے بارے میں بعض دیگر قابل لحاظ حوالوں کے لیے دیکھیے:

(i) تحقیق کی روشنی میں' ڈاکٹر عندلیب شادانی، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۳ - ۳۶۴

(ii) اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' لاہور ۱۹۷۲ء ص ۲۵۲-۲۵۵

(iii) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ڈاکٹر عبیدہ بیگم' لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص ۵۸۰ - ۵۸۴ [مرتب]

[3] گارساں دتاسی' مولوی کریم الدین' محمد یحییٰ تنہا، حامد حسن قادری' سید محمد اور بعض دوسرے اہل علم نے "دیوانِ جہاں" کا سنہ تالیف ۱۸۱۲ء ہی قرار دیا ہے۔ صحیح سال تالیف ۱۸۱۲ء ہے۔ [مرتب]

اور شاگردی کا ذکر ہے۔ پیدائش اور وفات کی تاریخوں کی طرف کوئی توجہ نہیں مختصر حالات کے بعد شاعر کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ دیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک منظوم دیباچہ اور آخر میں جہاں کا بہت سا کلام شامل ہے[1]۔ کتاب کا نام 'دیوانِ جہاں' رکھنے کا سبب بھی غالباً یہی ہے۔ چند شاعروں کا ذکر نمونے کے طور پر درج ہے[2]۔

ولی تخلص، نام میرزا محمد ولی معروف آگاہ شاہ اسرار اللہ کے بھتیجے، دکن کے رہنے والے۔ یہ اُن سے ہے:

اس قد سے جس چمن میں وہ نونہال ہوگا — کیا سرو کیا صنوبر ہر اک نہال ہوگا

ولاؔ تخلص، نام میرزا لُطف علی، عرف مظہر علی خاں خلف سلیمان خاں عرف میرزا محمد زمان خاں و دادا ابن محمد حسین بخطاب علی قلی خاں۔ دلّی کے رہنے والے، ہمیشہ عمدہ روزگار رہے۔ بالفعل کلکتہ میں تشریف رکھتے ہیں اور اس خاکسار پر نہایت مہربانی فرماتے ہیں۔"

"افسوسؔ تخلص، نام میر شیر علی۔ میر علی مظفر خاں کے بیٹے۔ پہلے تھوڑے دنوں میر سوزؔ سے اصلاح لی، بعد اس کے شاگرد ہوئے میر حیدر علی حیرانؔ کے۔ نارنول کے رہنے والے، کلکتہ میں آن کر رحلت کی۔"

محبّتؔ تخلص، نام نواب محبت خاں۔ نواب حافظ رحمت خاں کے بیٹے، بریلی کے رہنے والے۔ اس نحیف پر نہایت مہربانی فرماتے تھے اور ہفتہ میں ایک بار چہار شنبہ کے دن اس خاکسار کے غریب خانہ میں تشریف لاتے تھے۔"

فورٹ ولیم کالج میں ہر سال ۲۸۔ جولائی کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا[3] جس میں کالج کے

---

[1] کریم الدین، حامد حسن قادری اور صاحب اربابِ نثرِ اُردو سید محمد نے بھی یہی لکھا ہے، لیکن کلیم الدین احمد کے مرتبہ مطبوعہ نسخے، نیز ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کے خطی نسخے میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی شہادت کے مطابق حمد، منظوم سببِ تالیف اور مدح کے علاوہ بینی نرائن جہاں کا کوئی کلام شامل نہیں۔ [مرتب]

[2] اربابِ نثرِ اُردو صفحہ ۲۵۵ و ۲۵۶ بہ حوالۂ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ

[3] داستانِ تاریخِ اُردو، حال بینی نرائن جہاںؔ، صفحہ ۱۳۵

شعرا کے علاوہ باہر کے شاعر بھی جمع ہوتے تھے۔ دیوانِ جہاں کے قلمی نسخے میں ایک گلدستہ ایک مشاعرے کا بھی شامل ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل شاعروں کی غزلیں موجود ہیں:

مرزا کاظم علی جوان دہلوی، سید حیدر بخش حیدری دہلوی، افتخار الدین علی خاں شہرتؔ، سید جعفر علی رواں لکھنوی، مرزا ہاشم علی عیاںؔ پسر خورد جوانؔ، ابوالقاسم خاں قاسم دہلوی، مرزا قاسم علی پسر کلاں جوانؔ، مظہر علی خاں ولاؔ دہلوی۔

یہ تذکرہ چھپا نہیں۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ تذکرے کا نمونہ اسی نسخے سے حاصل کیا گیا ہے۔

جہاںؔ کی تیسری[1] تالیف 'تنبیہ الغافلین' جو شاہ رفیع الدین صاحب کی اسی نام کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے مولانا سید احمد (شہید) بریلوی کے ارشاد پر اُردو میں منتقل کی گئی تھی[2]۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

---

[1] انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) علی گڑھ (دہلی کے کتب خانے میں بینی نرائن جہاں کی ایک غیر مطبوعہ قلمی داستان "باغِ عشق" محفوظ ہے۔ یہ داستان عبدالرحمٰن جامی کی مشہور منظوم فارسی داستان لیلیٰ مجنوں کا اُردو نثر میں ترجمہ ہے۔ ایم حبیب خاں نے اس کا پہلی بار تعارف کرایا ہے، (اُردو کی قدیم داستانیں، ص ۸۸۔۱۰۲) "باغِ عشق" کے دیباچے میں بینی نرائن جہاں نے اپنے حالات لکھے ہیں جو ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بینی نرائن نے اپنی کتابوں میں چار گلشنِ بہارِ عشق، گلزارِ حُسن، دیوانِ جہاں، گل صنوبر اور باغِ عشق کے نام لیے ہیں۔ "باغِ عشق" کے دیباچے میں بینی نرائن نے اپنی جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے بہارِ عشق، گلزارِ حُسن، اور گل صنوبر تین کتابوں کے نام بالکل نئے ہیں۔ قصہ گل صنوبر ہی کا نام بینی نرائن نے غالباً "نوبہار" رکھا تھا۔ گلزارِ حُسن میں یوسف و زلیخا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیے دیباچہ نوبہار (بحوالہ مقالہ قاضی عبدالودود) ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، جولائی ۱۹۵۹ء، ص ۴۲ و بعد [مرتب]

[2] گارساں دتاسی کا بیان ہے (خطبہ مرہ ۱۸۵۴ء، مطبوعہ انجمن ترقی اُردو) کہ جہاںؔ مسلمان ہو گئے تھے اور سید صاحب موصوف سے بیعت تھے۔

اس کا نمونہ ڈاکٹر زور کی وساطت سے حاصل کر کے صاحب "ارباب نثر اردو" نے نقل کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۲۲۴ کی عبارت یہ ہے:

"بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے، ان میں ایک بڑا دانا تھا۔ اُس نے اپنے بھائیوں سے کہا "اے بھائیو! ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجالائیں۔ بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملے گی تم دونوں بانٹ لیجو۔ یہ بات سن کے وہ بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت اُن کی کرنے لگا۔ جب ماں باپ اُن کے مرگئے، یہ دونوں بھائی ورثہ اُن کا پاکر خوش گزران کرنے لگے اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا۔ "اے بھائیو! جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو، میں اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی رنڈی یہ بات سن کر قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات بے چارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے، فلاں جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں تو نکال لے۔ اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا کیا۔ بعد اس کے جو اس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔"[1]

---

[1] تنبیہ الغافلین کے جو ترجمے عام طور سے رائج ہیں اُن میں ۲۵ باب ہیں۔ بینی نرائن کا مذکورہ ترجمہ ۲۰ باب کا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ مروجہ ترجموں میں سے اُن کا کوئی نہیں۔ ایک ترجمہ میں، جو سید محمود، محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی صاحبان نے مل کر کیا ہے یہ الفاظ ملتے ہیں:

"اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو جس میں ۲۰ باب تھے فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط ہیں۔"

اس عبارت میں جس نسخے کی طرف اشارہ ہے، قیاس کہتا ہے کہ وہ بینی نرائن کا ہے اس قیاس کو کئی باتوں سے تقویت پہنچتی ہے۔ کتاب میں بیس باب ہیں، اُس کی آیتیں اور حدیثیں غلط ہیں اور وہ فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ بیس باب کی تائید انڈیا آفس والے نسخے سے ہوتی ہے۔ جہاں تک آیتوں اور حدیثوں سے پوری طرح واقف ہونا قرین قیاس ہے۔ ہندی کا لفظ فورٹ ولیم کالج کے مؤلفین نے بار بار اردو کے لیے استعمال کیا ہے۔ شاید بینی نرائن نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔

مرزا جان طپش:

طپش کو، جن کا اصل نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے اور جو مرزا جان کے نام سے معروف ہیں کالج کے اہل قلم کے باقاعدہ گروہ میں شامل نہیں سمجھا جاسکتا۔ کالج سے اُن کا تعلق اسی حد تک ہے کہ کالج نے ان کا کلیات خرید کر شائع کیا تھا اور اُن سے مترجمین کے ترجموں کی نظر ثانی اور قدیم اساتذہ کے کلام کے انتخاب میں مدد لی تھی۔

طپش کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے اور اُن کا سلسلۂ نسب بخارا کے معروف بزرگ سید جلال الدین المعروف بہ جلال بخاری سے ملتا ہے۔ ان کے والد مرزا یوسف بیگ کا پیشہ سپہ گری تھا۔ وہ بخارا چھوڑ کر دہلی آگئے تھے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اُن کے آنے کا صحیح زمانہ کسی نے نہیں بتایا۔ طپش دہلی میں پیدا ہوئے اور فیلن کے بیان کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش (۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء) ہے[1]۔ بچپن اور جوانی دہلی میں گزری اور یہیں باکمال علما، کی خدمت میں عربی و فارسی میں مہارت

---

[1] ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے تلاش اور تجزیے کے بعد طپش کا سال ولادت ۱۷۴۴ء کے قریب قیاس کیا ہے۔ طپش کی ایک بیاض کی آخری یادداشت ۱۸۱۴ء کی ہے، گویا اس وقت تک وہ حیات تھے۔ اس بیاض کے ضمن میں رجوع کیجئے مقالہ ڈاکٹر نجم الاسلام ("بیاض مرزا جان طپش") مطبوعہ نقوش، لاہور، شمارہ ۱۰۸، ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۸۱-۹۲ طپش کے احوال میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی کاوش قابل مطالعہ ہے۔ دیکھیے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۱۷۶-۱۸۵ [مرتب]

حاصل کی۔ اس کے علاوہ سنسکرت کا مطالعہ بھی کیا اور اس میں دستگاہ پیدا کی۔ منشی کریم الدین (صاحب طبقات الشعرا) کے بیان کے مطابق انھیں عروض و بلاغت پر بڑا عبور تھا اور محاورے اور روزمرّہ سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔ انھیں کے بیان کے مطابق ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں شعرگوئی کا شوق ہوا اور مرزا محمد یار بیگ سائل کے شاگرد ہوئے۔ پھر خواجہ میر دردؔ سے اصلاح لی۔

طپش مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے دربار میں فوجی خدمت پر مامور ہوئے۔ اور ۱۱۹۸ھ میں اُنہیں کے ساتھ لکھنؤ گئے۔ وہیں شعر و سخن کی مجلسوں میں اُن کے ذوقِ شعرگوئی کو جلا ملی۔ لکھنؤ سے مرزا جواں بخت کے ساتھ بنارس گئے اور ۱۲۰۱ھ تک وہیں رہے۔ اس کے بعد ڈھاکے چلے گئے اور وہاں شمس الدولہ نواب سید احمد علی خاں کے مصاحب مقرر ہوئے اور انہیں کے کہنے سے "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی۔ اُردو کے محاورات اور روزمرّہ اس کتاب کا موضوع ہیں۔ اس کتاب کا سنہ ترتیب ۱۷۹۲ء/ ۱۲۰۷ھ ہے۔ اس طرح اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔ کتاب پہلی مرتبہ (مرشد آباد) ڈھاکہ سے ۱۸۴۹ء/ ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوئی۔ کتاب میں اُردو محاوروں کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں اور مثال میں اُردو کے اساتذہ کے اشعار درج ہیں۔ مثالیں میرؔ، سوداؔ، ولیؔ، سراجؔ، جرأتؔ اور ان کے علاوہ دوسرے شاعروں سے لی گئی ہیں۔ اس میں ۲۷۵ محاوروں کو ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔ کتاب کا نمونہ یہ ہے:

انگاروں پر لوٹنا: کنایہ از بے قراری کہ دو عالم رشک لاحق می گردد۔

ولیؔ دکنی می گوید ؎

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں — تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولیؔ

رفو چکر میں آنا: حیران ماندن بہ مشاہدۂ امرِ عجیب و عوام بازاری استعمال می کنند۔ سراج الدین سراجؔ می گوید ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخمِ عشق کو ٹانکے — اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آ جاوے

لرتی: بہ واوِ مجہول، بیائے معروف۔ کنایہ از مشورہ بستن و یوار است کہ در

ایامِ برسات بر دیوار گِل عارضی گردد۔ شاہ عزیز اللہ عزیز دکھنی گوید ؎

کانِ نمک ہوا ہوں ترا حسنِ سبز دیکھ — لونی برہ کی جب سے لگی گل گیا ہوں میں

میر حسن کی مثنوی کے طرز پر طپش نے ایک مثنوی بہار دانش کے نام سے لکھی ہے۔[۱] اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے، اس کی تاریخ "باغ و بہار" سے نکلتی ہے۔[۲]

مثنوی کے علاوہ طپش کا ایک کلیات بھی ہے، جسے کالج نے خرید کر شائع کیا تھا (۱۸۱۲ء) کلام کی تعریف و توصیف میں سب تذکرہ نویس متفق ہیں۔[۳]

---

[۱] اُردو مثنوی "بہار دانش" (مرزا جان طپش) کا ایک ایڈیشن خلیل الرحمٰن داؤدی نے مرتب کیا، اسے مجلس ترقی ادب، لاہور نے ستمبر ۱۹۶۳ء میں شائع کیا ہے، مصنف اور مثنوی کے بارے میں دیکھیے مقدمہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، ص ۱-۳۶ - ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے داؤدی صاحب کے بیانات سے شدید اختلاف کیا ہے اور بہار دانش کے بارے میں قیمتی معلومات فراہم کی ہیں تفصیل کے لیے دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۳۴۰-۳۴۸۔ [مرتب]

[۲] مثنوی کا ذرا تفصیلی ذکر اور اس کا نمونہ ارباب نثر اُردو میں درج ہے۔

[۳] تذکروں کے حوالوں اور کلام کے نمونے کے لیے ارباب نثر اُردو کا صفحہ ۱۸۶ و ۱۸۷ دیکھا جا سکتا ہے۔

میر عبداللہ مسکین :

گریرسن (لنگوئسٹک سروے آف انڈیا) فیلن اور کریم الدین (طبقات الشعرائے ہند) کی بیانات سے مسکین کے جو حالات فراہم ہوئے ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانۂ قیام میں یہ کالج میں ملازم ہوئے تھے اور اُن کے وطن چلے جانے کے بعد بھی عرصے تک وہیں رہے[1] فورٹ ولیم کالج میں رہ کر انھوں نے جو کام کیا ہے اُس میں مستقل تالیف شامل نہیں۔ گریرسن کا بیان ہے کہ "بیاضِ ہندی" کی تالیف میں وہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک تھے[2]

[1] مولّف "اربابِ نثرِ اُردو" نے مسکین کا حال چار صفحوں پر پھیلایا ہے اور بتایا ہے (ص ۲۶۱-۲۶۲) کہ "مسکین نے ڈاکٹر گلکرسٹ کے زمانۂ صدارت میں فورٹ ولیم کالج کی ملازمت اختیار کی اور ان کے انگلستان چلے جانے کے ایک عرصے بعد بھی وہیں ملازم رہے اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے"۔ عتیق صدیقی کا کہنا یہ ہے کہ "ان معلومات کے ماخذ کا ہم کو کوئی پتہ نہیں چلتا۔ فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں سے یا گلکرسٹ کی کسی تحریر سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ۱۹۷۹ء، ص ۱۴۱)"۔ [مرتب]

[2] محمد عتیق صدیقی کہتے ہیں کہ "گریرسن نے غلطی سے گلکرسٹ کے ساتھ عبداللہ مسکین کو بھی ہندی مینول (بیاضِ ہندی) کا مولف لکھ دیا ہے۔ گریرسن کو یہ غلط فہمی نہ جانے کیوں کر پیدا ہوئی کہ ہندی مینول گلکرسٹ اور عبداللہ مسکین کا مشترکہ کارنامہ تھا۔ اس نے یہ بات ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہ دہرائی ہے لنگوئسٹک سروے آف انڈیا کی نویں جلد کے علاوہ اس کی دوسری تالیفات میں اسی کا اعادہ کیا گیا ہے محمد عتیق صدیقی کو اگرچہ گلکرسٹ کی یہ تالیف نہیں مل سکی لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ (باقی اگلے صفحے پر)

ڈاکٹر گلکرسٹ نے اپنی قواعدِ اُردو میں اصطلاحات کی وضاحت اور صرف و نحو کے مسائل کی تشریح کے لیے ان کے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں[1] اس لیے کہ وہ عام فہم اور عام پسند تھے۔ مسکین اُردو میں مرثیہ گو کی حیثیت سے مشہور ہیں اور ان کے مراثی کا ایک مجموعہ مرتب ہو چکا تھا۔ اس مجموعہ کے متعلق اسپرنگر نے لکھا ہے کہ وہ شاہانِ اودھ کے کتب خانے میں موجود تھا اور اس کا نام "مجموعۂ مرثیہ ہائے مسکین" تھا۔ جن لوگوں نے مرثیہ گوئی کی تاریخ لکھی ہے انھوں نے مسکین کا سرسری ذکر کیا ہے۔

(حاشیہ گزشتہ سے آگے) کالج کونسل کی کارروائیوں میں ہر جگہ اس کتاب کا مولف صرف گلکرسٹ ہی کو لکھا گیا ہے۔ عبداللہ مسکین کا ایک مرثیہ اس کتاب میں یقیناً شامل کیا گیا تھا جو ۲۳ صفحات پر مشتمل تھا اور دیوناگری رسم الخط میں چھپا تھا (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ص ۱۴۰، ۱۴۱، ۲۷۵)۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے فورٹ ولیم کالج کے بارے میں تھامس روبک کی کتاب (مطبوعہ ہندوستانی پریس، کلکتہ ۱۸۱۹ء) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہندی مینول (بیاضِ ہندی) کی ترتیب میں شعبۂ ہندی کے مختلف منشیوں نے (مرتب: گلکرسٹ کا) ہاتھ بٹایا تھا (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات ص ۴۲۵) [مرتب]

[1] "ہندوستانی زبان کے قواعد" کے مختلف صفحات پر گلکرسٹ نے مثالیں دینے کے سلسلے میں جستہ جستہ مسکین کا ایک پورا مرثیہ جس کے اسّی اکاسی بند ہیں، نقل کر دیا ہے اور آخر میں ایک جگہ ترتیب وار اُن صفحات کی فہرست درج کی ہے جن پر جہاں تہاں اس مرثیے کے بند درج کیے گئے ہیں اور طلباء کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس مرثیے کو ترتیب وار نقل کریں کیونکہ مسکین کے مرثیے مبتدیوں کے لیے بے حد کارآمد ہیں۔" محمد عتیق صدیقی نے یہ پورا مرثیہ اپنی قابلِ قدر تالیف میں گلکرسٹ کی نشاندہی کے مطابق محفوظ کر دیا ہے۔ دیکھیے: گلکرسٹ اور اس کا عہد، ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۳ - ۲۵۳ [مرتب]

مرزا محمد فطرت :

مرزا محمد فطرت لکھنؤ کے رہنے والے تھے[1]۔ کسی ذریعے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ فورٹ ولیم کالج سے ان کا تعلق کب ہوا اور کب تک قائم رہا[2]۔ صرف گریرسن کے حوالے سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۰۱ء سے کچھ پہلے اُنھوں نے جارج ہیڈلے کی قواعد اُردو میں کچھ ترمیم کی تھی اور اس ترمیم کے بعد ۱۸۰۱ء میں یہ کتاب لندن سے شائع ہوئی تھی۔ اصل کتاب پہلی مرتبہ ۱۷۷۲ء میں چھپی تھی[3]۔

فورٹ ولیم کالج کے لیے فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے بائبل کا ترجمہ کیا تھا[4]۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا۔ آج کل بائبل کا جو نسخہ بائبل سوسائٹی کی طرف سے تقسیم ہوتا ہے وہ جزوی ترمیم کے علاوہ فطرت ہی کا کیا ہوا ترجمہ ہے۔ اس کی زبان میں سادگی اور متانت ہے اور اس طرح کی کتاب کے لیے یہ طرز بہت موزوں ہے۔

---

[1] مرزا محمد فطرت لکھنوی کے کسی قدر احوال کے لیے دیکھیے: گلکرسٹ اور اس کا عہد (محمد عتیق صدیقی) طبع دوم ۱۹۷۹ء ص ۱۶، ۱۷، ۱۶۱-۱۶۵ (مرتب)

[2] محمد عتیق صدیقی نے پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم (نیشنل آرکائیوز آف انڈیا) جلد اول کے حوالے سے بتایا ہے کہ مرزا محمد فطرت لکھنوی کو ۵۔ نومبر ۱۸۰۳ء سے انجیل کے فارسی اور ہندوستانی (اُردو) ترجمے کے لیے اسّی روپے ماہوار پر فورٹ ولیم کالج میں 'منشی' مقرر کیا گیا: گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ۱۹۷۹ء، ص ۱۶۱-۱۶۲، ۲۷۴-۲۷۵ (مرتب)

[3] محمد عتیق صدیقی کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق ہیڈلے (HADLEY) نے ۱۷۶۵ء میں ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک مختصر سی کتاب لکھی۔ اس کی ایک نقل لندن کے ایک ناشر کے ہاتھ لگ گئی جس نے ۱۷۷۰ء میں اس کو چھاپ دیا۔ اس کے بعد خود ہیڈلے نے اس کا ایک نیا اور تصحیح شدہ ایڈیشن ۱۷۷۲ء میں لندن ہی سے شائع کیا۔ ہیڈلے کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۷۷۴ء میں تیسرا ۱۷۷۹ء میں اور چوتھا ۱۷۸۴ء میں پانچواں ۱۷۹۶ء میں چھٹا ایڈیشن اس کی وفات کے بعد ۱۸۰۲ء میں اور آخری ایڈیشن ۱۸۰۹ء میں شائع ہوا۔ ہیڈلے کی لغت کا جو ایڈیشن اُس کی وفات کے بعد ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا تھا، مرزا محمد فطرت لکھنوی نے اس کی صرف "تصحیح" ہی نہیں کی تھی بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا تھا۔ (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ۱۹۷۹ء ص ۱۲-۱۶) (مرتب)

[4] بائبل کے فارسی اور ہندی (اُردو) ترجمے کے سلسلے میں تفصیل کے لیے رجوع کیجیے: گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ص ۱۶۱-۱۶۵ (مرتب)

میر معین الدین فیض :

میر معین الدین نام تھا اور فیض تخلص[1]۔ ان کے بزرگ سمرقند کے رہنے والے تھے۔ گیارہ نسل پہلے آبا و اجداد میں سے کوئی دلی آ گیا اور یہاں سکونت اختیار کر لی۔ فیض یہیں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی۔ دلی تباہ ہوئی تو شہر چھوڑ کر غازی پور چلے گئے۔ جن دنوں ڈاکٹر گلکرسٹ نے زبان اُردو کی تحصیل و تحقیق کے لیے مختلف شہروں کا دورہ کیا وہ غازی پور بھی گئے اور یہاں اُن کی ملاقات فیض سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب ان کے علم و فضل اور ذوق سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے اور کالج میں ملازم رکھ لیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے سے فیض نے ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ میں حضرت شیخ فریدالدین عطار کے پند نامہ کا منظوم ترجمہ کیا اور اس کا نام چشمۂ فیض رکھا[2]۔ اس کتاب کے ایک قلمی نسخہ کا ذکر اسپرنگر نے اپنی فہرست میں کیا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کتاب چھپی یا نہیں[3]۔

---

[1] صاحب "ارباب نثرِ اُردو" نے اسپرنگر کی فہرست شاہانِ اودھ کے حوالے سے ان کا نام میر محی الدین اور فیض تخلص بتایا ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی تحقیق کے مطابق یہ اطلاع درست نہیں ہے۔ ان کا نام میر معین الدین اور فیض تخلص تھا۔ فیض کے احوال میں قیمتی معلومات کے لیے دیکھیے: فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۱۶۶-۱۶۸ (مرتب)

[2] محمد عتیق صدیقی نے معین الدین کے اس منظوم ترجمے کو "نثری" کاوش بتایا (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۵۱-۱۷۴) جو ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی شہادت کے مطابق صحیح نہیں (فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۲۹۵) (مرتب)

[3] "چشمۂ فیض" غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود ہے۔ اس میں کل ۳۶ اوراق ہیں۔ فیض نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر یہ منظوم ترجمہ ۱۸۰۳ء میں شروع کیا اور ۱۸۰۴ء میں یہ رسالہ ختم ہوا۔ اس قلمی نسخے کے تعارف اور تفصیل میں ڈاکٹر عبیدہ بیگم کی کتاب ایک اچھا ماخذ ہے۔ دیکھیے: کتاب مذکور، ص ۲۹۵-۲۹۸ (مرتب)

سید حمید الدین بہاری:

سید حمید الدین بہاری کے حالات پردۂ خفا میں ہیں[1]۔ برٹش میوزیم کی ایک کتاب "الوانِ نعمت" کے متعلق بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ وہ ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر سید حمید الدین نے مرتب کی تھی[2]۔ اس کتاب کے سنہ تالیف کا پتہ نہیں چلتا[3]، نہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید حمید الدین نے اس کی ترتیب کالج کے ملازم کی حیثیت سے کی تھی یا یوں ہی ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے سے اپنے طور پر کر دی تھی[4]۔

کتاب کا حجم تقریباً ڈھائی سو صفحے ہے۔ اس کے چوبیس باب ہیں جن میں ہر ایک باب کو "خوان" کہا گیا ہے۔ ان "خوانوں" میں ان سب کھانوں اور مٹھائیوں کا حال درج ہے جو اس زمانے میں مسلمانوں میں رائج تھے۔ ہر کھانے کے ذکر کے ساتھ اس کے اجزا اور پکانے کی ترکیب بھی وضاحت سے لکھی گئی ہے۔ آخری باب میں طعام خانہ کی اصطلاحوں کی ایک فرہنگ شامل ہے۔

---

[1] بطور منشی "حمید الدین بہاری کا تقرر فورٹ ولیم کالج میں ۹۔ اگست ۱۸۰۲ء کو ہوا۔ ان کا مشاہرہ تیس روپے ماہوار تھا (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم ۱۹۷۹ء ص ۱۰۸) [مرتب]

[2] بلوم ہارٹ سے کتاب کے نام میں سہو ہوا ہے۔ حمید الدین کی کتاب کا نام "خوانِ نعمت" (خوانِ الوان) ہے۔ [مرتب]

[3] "خوانِ نعمت" (خوانِ الوان) ۱۸۰۳ء میں چھپ گئی تھی۔ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) صفحات کی اس کتاب پر عتیق صدیقی کے بقول گلکرسٹ نے اگست ۱۸۰۳ء میں حمید الدین کے لیے ایک سو روپے کے نقد انعام کی سفارش کی تھی (گلکرسٹ اور اس کا عہد، طبع دوم، ص ۱۴۸) جسے ڈاکٹر عبیدہ بیگم درست نہیں مانتیں۔ انہوں نے اصل ماخذ کی بنیاد پر یہ بتایا ہے کہ ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء کی انعام کے لیے سفارشی فہرست میں گلکرسٹ نے اس پر اسی (۸۰) روپے انعام کی سفارش کی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، ص ۵۱۰ [مرتب]

[4] سید حمید الدین نے گلکرسٹ کے "حکم" پر کھانوں کے اقسام کی کتاب "خوانِ الوان" کا "خوانِ نعمت" کے نام سے ترجمہ کیا۔ کالج کونسل کی کارروائیوں میں خوانِ نعمت کا نام خوانِ الوان ہی درج ہے "خوانِ نعمت" کا ایک نامکمل قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال میں موجود ہے۔ ڈاکٹر عبیدہ بیگم نے اس کا تعارف کرایا ہے، دیکھیے ان کی کتاب ص ۵۰۹ - ۵۱۱ [مرتب]

فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا مجموعی جائزہ:

فورٹ ولیم کالج شمالی ہند کا پہلا علمی، ادبی اور تعلیمی ادارہ ہے جہاں اجتماعی حیثیت سے، ایک واضح مقصد اور منظم ضابطہ کے تحت ایسا کام ہوا جس سے اردو زبان اور ادب کی بڑی خدمت ہوئی۔ اس ادارے کے ماتحت جو علمی اور ادبی تخلیقات ہوئیں وہ جہاں ایک طرف بجائے خود علمی اور ادبی اعتبار سے بڑی اہم ہیں، دوسری طرف ان کی اہمیت اور افادیت اس بنا پر ہے کہ انھوں نے اردو زبان اور اردو ادب کے مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں بہت بڑا حصہ لیا۔ ان علمی اور ادبی تخلیقات نے اردو ادب اور خصوصاً اردو نثر کے اسلوب اور روش کو ایک نئے نہج پر ڈال دیا، اور یہی اسلوب انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے سے اردو نثر کا خاص اسلوب بن گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو میں تصنیف و تالیف کا جتنا کام کالج سے منسلک اور وابستہ رہنے والے اہلِ علم اور اہلِ قلم ماہرین نے کیا اس پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کالج کے زیرِ اہتمام جو کتابیں ترتیب، تالیف یا ترجمہ ہوئیں ان میں قواعد و لغت، تاریخ و تذکرہ، مذہب و اخلاق اور قصے کہانیوں کی کتابیں شامل ہیں اور ان میں سے ہر موضوع کی اپنی اپنی جگہ جو علمی و افادی حیثیت ہے اس سے قطع نظر تالیف، ترتیب اور ترجمے کے اس سرمایے نے پہلی

مرتبہ اردو ادب کے ذخیرے کو علمی اساس دی اور اس نے غیر دلچسپ زبان میں لکھے ہوئے مذہبی اور تبلیغی رسالوں اور پُر تکلف عبارت میں لکھی ہوئی داستانوں اور تمثیلوں کی مقید حدود سے باہر نکل کر علوم کی وسیع تر سرزمینوں میں قدم رکھا اور اس طرح اُردو ادب کا سرمایہ پہلی مرتبہ علمی وقعت و وقار کا حامل بنا۔ اور اس میں علمی و ادبی کاموں کو اصول و قواعد کے تحت انجام دینے کی روایت کا آغاز ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کی تالیفات کو موضوع کے اعتبار سے اگر حصوں میں تقسیم کر کے ان میں سے ہر حصے پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو یہ اندازہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ اُس کی مختلف موضوعات کی تالیفات کی اساس علمی بھی ہے اور اصول و ضوابط کی پابند بھی۔ مثلاً کالج میں قواعد و لغت کا جتنا کام ہوا اُس پر ایک نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے لغت اور قواعد کی مختلف کتابیں مرتب و مدون کرتے وقت اُردو زبان کی تاریخ، اُس کی معاشرتی اور تہذیبی خصوصیات اور ان معاشرتی اور تہذیبی خصوصیات سے پیدا ہونے والے ایک مخصوص مزاج کو پیشِ نظر رکھا اور کبھی اس کے روزمرہ اور محاورے کی اس اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جو ایک زبان اور دوسری زبان میں امتیاز کا باعث بنتا ہے۔ اس معاشرتی تہذیبی اور مزاجی خصوصیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو زبان کے مزاج میں دخل پانا اور اس کے اظہار کے امکانات اور نزاکتوں سے واقف ہونا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے لغت اور قواعد کے کام میں اس تعلیمی نکتہ کو اپنی بنیاد بنایا اور اس کے بعد یہ سوچا کہ ایک ایسے شخص کو جو زبان کے مزاج سے پوری طرح آشنا نہیں ہے اس زبان کے سیکھنے اور برتنے میں کیا دقتیں پیش آ سکتی ہیں۔ ان دقتوں کو سامنے رکھ کر لغت اور قواعد کی تالیف ایسے انداز سے کی اور کروائی کہ کام کی علمی حیثیت بھی کم نہ ہونے پائے، اُس کی سائنٹفک بنیاد یا کام کا نظم و ضبط بھی قائم رہے اور وہ عملی اعتبار سے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بن سکے۔ قواعد و لغت کی ترتیب و تدوین کی بالکل ابتدائی منزل میں اُسے سائنٹفک، تہذیبی اور علمی بنیادوں پر قائم کرنا فورٹ ولیم کالج کے

شعبۂ تالیف اور اس کے صاحبِ نظر رہنما ڈاکٹر گلکرسٹ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس کارنامے کا عکس اُردو زبان کا مطالعہ کرنے والوں کو قواعد و لغت کی اُن سب کتابوں میں نظر آتا ہے جو اُنیسویں اور بیسویں صدی میں مدوّن و مرتّب کی گئیں۔ اس موضوع پر ہر قابلِ ذکر تالیف اور تصنیف دوسری تالیف و تصنیف کے مقابلے میں اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کے مولف اور مصنف نے اپنے کام کی بنیاد کسی نہ کسی اصول پر رکھی ہے اور اپنے کارنامے کو اسی اصول کے ماتحت کوئی منطقی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

سائنٹفک اصول و ضوابط کی پابندی اور ادبی کاموں کو علمی اور عملی اساس دینے کا یہ رُجحان تاریخ و تذکرے اور دوسری علمی و مذہبی کتابوں کی ترتیب، تالیف اور ترجمے میں بھی واضح ہے۔ فورٹ ولیم کالج والوں نے فارسی سے اُردو میں جتنی کتابوں کے ترجمے کروائے اُن کی علمی اور افادی دونوں حیثیتیں مسلم ہیں۔ شیر علی افسوس کی آرائشِ محفل، حیدری کی تاریخِ حیدری، وِلا کی تاریخِ شیر شاہی اور حسینی کی تاریخِ آسام ایسی کتابوں کے ترجمے ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اہم ہیں اور ان کا استناد بھی مسلم ہے۔ لطف کا تذکرہ گلشنِ ہند، حیدری کا تذکرہ گلشنِ ہند، بینی نرائن جہاں کا دیوانِ جہاں، ایک خاص ضرورت اور مقصد کے ماتحت مرتب کروائے گئے تھے اور ان سے اُردو میں تذکرہ نگاری کی روایت کا آغاز ہوا۔ اسی طرح علمی اور مذہبی کتابوں میں سے اخلاقِ جلالی، ہدایت الاسلام اور تنبیہ الغافلین کا انتخاب بھی اس بات کی دلیل ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اربابِ اقتدار اخلاق اور مذہب کے موضوعات پر بھی صرف ایسی کتابیں تالیف کروانا چاہتے تھے جن کا علمی وقار بھی مسلم ہو اور جو نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی پڑھنے والوں کے لیے ایسی معلومات مہیا کرنے کا ذریعہ بن سکیں جو نہ صرف اخلاقی تہذیب کے لیے ضروری اور اہم ہیں بلکہ جن سے ایک خاص معاشرے کے مزاج کو سمجھنے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے کلام مجید کا صاف اور سلیس ترجمہ کرانے کا جو منصوبہ بنایا تھا اور جو اُن کے انگلستان چلے جانے کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ جو اُردو زبان اور ادب کا مطالعہ

کر کے اس کے مزاج میں پوری طرح دخیل ہونا چاہتے ہیں انھیں یہ اندازہ ہو سکے کہ مسلمانوں کے فکر اور تخیل پر قرآنی تعلیمات اور اس کے فلسفے کا کتنا گہرا اثر ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کرنے کے بعد وہاں ایک منظم انداز سے صرف ایسے لکھنے والوں کو اکٹھا کرنا جنھیں اردو روزمرہ پر پوری قدرت حاصل ہو کوئی اتفاقی بات نہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ جو اُردو کے پُوری طرح مزاج شناس تھے یہ جانتے تھے کہ انگریزوں کو اُردو سے روشناس کرانے کے لیے اور اُن کے دلوں میں اس زبان اور ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُنھیں پڑھنے کے لیے ایسی کتابیں دی جائیں جو نہ صرف آسان اور عام فہم زبان میں لکھی ہوئی ہوں بلکہ جن میں روزمرہ اور محاورے کا وہ چٹخارہ اور چاشنی بھی ہو جو مقامی معاشرت اور تہذیب کے رچاؤ اور لگاوٹ کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے انہوں نے اپنے گرد صرف ایسے لوگوں کا حلقہ بنایا جو اس شرط کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے پورا کرتے تھے۔ میرامّن، حیدریؔ، افسوسؔ اور حُسینیؔ کے نام اس بات کے شاہد ہیں کہ جب کسی گروہ سے اور خاص کر لکھنے والوں کے کسی گروہ سے کسی خاص طرح کا کام لینا ہو تو اُن کے انتخاب میں اُس کام کی نوعیت کا پیشِ نظر رکھنا اُس کام کی کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ چونکہ ڈاکٹر گلکرسٹ اپنے کالج کے لیے اور کالج کے باہر ایک وسیع تر حلقے کے لیے جلدی سے جلدی ایسی کتابیں مہیا کرنا چاہتے تھے جو اُنھیں زبان کے سیکھنے، زبان کا صحیح مزاج سمجھنے، ایک مخصوص معاشرے سے روشناس ہونے اور اس کی معاشرتی اور تہذیبی روایات کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانے میں مدد دے سکیں اس لیے بہتر یہی تھا کہ مختلف لکھنے والوں سے مستقل تصنیف کا کام لینے کے بجائے اُن سے ایسی کتابوں کے ترجمے کرائے جائیں جن میں اس معاشرے کی معاشرتی اور تہذیبی روایات کا عکس موجود ہے اور جن میں اس کا مزاج پوری طرح رچا بسا ہوا ہے۔ اس دور بینی اور دور اندیشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فورٹ ولیم کالج کے اہلِ قلم شاعروں نے فارسی سے اور بعض صورتوں میں سنسکرت اور بھاشا سے ایسی کتابوں کے ترجمے کیے جو اس معاشرتی اور تہذیبی مقصد کے حصول میں زیادہ سے زیادہ معاون ہو سکیں۔ اسی طرح اُردو میں

[illegible]

[عکسِ تحریر پروفیسر سید وقار عظیم، ورق نمبر ۱۰۴]

پہلی مرتبہ ایک وسیع پیمانے پر ایک منظم اور باضابطہ انداز میں تصنیف و تالیف کے مقابلے میں ترجمے کی اہمیت واضح ہوئی اور ترجموں کی ان منظم مساعی نے اُردو نثر میں ترجمے کی روایت کا ایسا آغاز کیا جس سے آگے آنے والوں نے اپنی شمعیں روشن کیں۔ اُردو نثر کی تاریخ میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کی جتنی تحریکیں اُنیسویں اور بیسویں صدی میں شروع کی گئیں اور چلائی گئیں اُن سب کی زندگی میں فورٹ ولیم کالج کی اُس روایت کی دھڑکن سُنائی دیتی ہے، جو ترجمے کو ایک مستقل حیثیت دے کر شروع کی گئی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کا ایک عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تصنیف و تالیف کی اُس اہمیت کو مسلّم بنانے کے ساتھ جس کا تعلق موضوع کی افادیت اور دلچسپی کے علاوہ اُس کے معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں سے ہے، یہ بات بھی واضح کی کہ تصنیف و تالیف کے کام میں اسلوب بیان اور اندازِ اظہار بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا موضوع۔ کوئی کتاب جن لوگوں کے لیے لکھی جائے یا کسی بات کا جن لوگوں کے دلوں میں اُتارنا مقصود ہو اُسے اُنھیں اُن کی ذہنی سطح تک لانا کام کی کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ ایک دوسری شرط یہ بھی ہے کہ بات جس اسلوب میں ادا کی جائے، وہ سلیس، سادہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ اس زبان کے محاورے اور روزمرّہ کے عین مطابق ہو جس میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ان ملی جلی اور لازمی شرائط کے پُورا کرنے پر ڈاکٹر گلکرسٹ نے اور اُن کے ایما اور مشورے پر فورٹ ولیم کالج کے مولفین نے جتنا زور دیا ہے وہ ان کی تالیفات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے اور اُس سے ایک بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی روایت اظہار و ابلاغ کے معاملے میں یہ ہے کہ بات خواہ کچھ بھی ہو اور کیسی ہی ہو اُسے آسان سے آسان زبان میں ادا کرنا چاہیے۔ سلاست، سادگی اور اس کے ساتھ محاورے کی پابندی اچھے اظہار کی اولین اور اہم ترین شرط ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مختلف مُولفین اور مترجمین نے اپنے اپنے اندازِ خاص میں اسی شرط کی پیروی و پابندی کرکے اُردو نثر میں سادہ نگاری کی اور ایسی سادہ نگاری کی، جو ادب اور انشا کے شرائط کو بھی پُورا کرتی ہو، تحریک کا آغاز کیا اور اس طرح اُس زبان کو جسے اب تک صرف پُرتکلف

داستان سرائی یا ایک محدود پیمانے پر مذہبی و اخلاقی تبلیغ کی زبان سمجھا جاتا تھا، خاصی بلند علمی سطح پر کھڑا کردیا، اور اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ اُردو کی سادہ نثر میں مزےدار قصے کہانیاں سُنانے کے علاوہ، مستند اور معتبر تاریخیں لکھنے اور موثر دینی و اخلاقی مسائل کے واضح اور ذہن نشین کرنے کی بھی بے پایاں صلاحیت ہے۔ اُردو کا وہ نثار جو اپنے محاورے سے اور اپنی زبان کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے، سادہ اور دلنشین پیرائے میں اور آسان اور سلیس طرز میں ہر بات کہہ سکتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی مختلف الموضوع اور متنوع تالیفات اردو نثر کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو واضح کرنے کے علاوہ اُس کے وسیع امکانات کی طرف اشارہ کرتی ہیں، اور یہ اشارہ اتنا واضح ہے کہ آنے والے زمانے نے اسے اپنا راہبر و رہنما بنایا ہے۔ اس لیے یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ انیسویں صدی کے وسط میں ترجمہ و تالیف کے کام میں سادہ نگاری کا جو میلان نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے اُس میں فورٹ ولیم کالج کے اس اشارے کو بھی خاصا دخل ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے ماتحت جن مختلف کتابوں کے ترجمے ہوئے اُن میں سب سے زیادہ تعداد قصہ کہانیوں کی ہے۔ ان قصّہ کہانیوں میں سے کچھ طویل ہیں، کچھ طویل تر اور کچھ ایسی اخلاقی کہانیوں کے مجموعے ہیں جن کے ذریعے کہانی لکھنے والوں نے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دیا ہے لیکن ان طویل قصوں یا داستانوں اور چھوٹی کہانیوں کی بنیاد جس اخلاقی تعلیم و تلقین پر ہے اُس سے قطع نظر ان میں دو باتیں مشترک ہیں، ایک دلچسپی کا عنصر اور دوسرے ان میں رچا ہوا معاشرتی اور تہذیبی رنگ۔ داستان گویوں اور قصّہ نویسوں نے داستانوں اور کہانیوں کو اُردو میں منتقل کرتے وقت اول تو اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہ قصّے پڑھنے والے کے لیے لطف و انبساط کے حصول کا ذریعہ بن سکیں اور دوسرے ان پر اُن کے زمانے کی معاشرت اور اس کے مخصوص مزاج کا رنگ چھایا ہوا ہو۔ ان قصوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے جو مختلف ذرائع استعمال کیے گئے ہیں اُنھیں کو اُردو میں داستان کے فن کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ چھوٹے قصے کو بڑھا کر طویل بنانا، قصے میں ہر طرح کے غیر فطری

عناصر سے کام لینا، جنوں، دیووں، پریوں، ساحروں اور عجیب الخلقت جانوروں کو اپنی تخلیقی دنیا کی رونق سمجھنا، اپنے وضع کیے ہوئے کرداروں کو فوق الفطرت خصوصیات کا حامل بنانا، اُن کی ناکامیوں کو ناقابلِ یقین حوادث و اتفاقات کی مدد سے کامیابیوں کی صورت دینا، اور کہانی کو تخیل و تصور کی جولانیوں کی آماجگاہ بنانا، اُن کے فن کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ اور یہی کرشمے داستانوں کے فن کی روایت بن گئے ہیں۔ انھیں غیر فطری اور غیر حقیقی ہونے کے باوجود فنی جواز حاصل ہے۔ تخیل اور تصور کی آباد کی ہوئی اس عجیب و غریب دنیا میں ہر چیز طلسم و فریب کے سہارے زندہ ہے، لیکن یہاں سے نیکی کے بے شمار سبق سیکھ کر حقیقت کی تلخ دنیا میں واپس آتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے وہ تمام قصے (جنہیں داستانیں کہنا زیادہ صحیح ہے) جو اپنی تفصیلات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، کم و بیش انھیں فنی بنیادوں پر قائم ہیں۔ اس لیے یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ اُردو میں داستان گوئی کے فن کی روایت کا چراغ فورٹ ولیم کے داستان گویوں نے روشن کیا۔ یہی چراغ ہے جس کی لَو سے آگے آنے والوں نے داستان کی محفلیں آباد کرتے وقت اپنے فانوسِ خیال کے لیے روشنی حاصل کی ہے۔ اُردو میں داستان کے فن کی روایت کا سرچشمہ فورٹ ولیم کالج کے قصے کہانیاں ہیں۔

ان قصے کہانیوں یا داستانوں کی اہمیت دو اور باتوں کی وجہ سے بھی ہے۔ پہلی تو یہ کہ ان داستانوں نے ادب کے مطالعے کی اس بنیادی حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں واضح کیا ہے کہ ادب اور خصوصاً افسانوی ادب کا معاشرتی زندگی کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ادب میں ہمیں اس معاشرے کی خارجی زندگی کے مرقعے اور داخلی زندگی کے عکس بڑی صفائی سے دکھائی دیتے ہیں، جس میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور یہ بات دوسرے اصناف سے کہیں زیادہ افسانوی ادب کے معاملے میں صحیح ہے۔ میرامّن کی باغ و بہار اور حیدری کی آرائشِ محفل اور اشک کی داستانِ امیر حمزہ کی اصل گو فارسی کے قصے ہیں اور ان پر تخیل کے اعتبار سے فارسی ماحول کا غلبہ ہے، لیکن ترجمہ کرنے والوں نے جب یہ کہانیاں اپنی زبان میں منتقل کیں تو ان فارسی الاصل

کہانیوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی اٹھارویں صدی کی معاشرت کا رنگ جھلکنے لگا۔ واقعات کی جزئیات، مناظر کی کیفیت اور کرداروں کی رفتار و گفتار پر ہندی معاشرت کا گہرا نقش نظر آنے لگا۔ اسی طرح طوطا کہانی، بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی میں ہندو تہذیب، اخلاق اور معاشرتی اقدار کے غلبے کے باوجود مسلمانوں کے طرزِ فکر و تخیل کی جھلک پیدا ہو گئی اور اس طرح یہ حقیقت ادب کے ایک مسلّمہ قانون کی حیثیت سے اُردو ادب میں داخل ہو گئی کہ لکھنے والا خواہ تخیل کی بلند پروازیوں اور تصور کی ندرت آفرینیوں کا کتنا ہی دلدادہ کیوں نہ ہو، اور خواہ وہ حقائق کی دنیا سے کتنی ہی بیگانگی کیوں نہ برتے اُس کے لیے زندگی سے فرار ممکن نہیں۔ اُس نے جس ماحول میں زندگی کے دن گزارے ہیں۔ اُس نے جن حقائق کا مشاہدہ کیا ہے اور اسے جن تجربات سے دوچار ہونے کا موقع ملا ہے وہ سب اُس کی ذہنی زندگی پر چھا چکے ہیں۔ وہ اس کے فکر، تخیل اور تصور میں، اُس کے محسوس کیے بغیر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہ جب کچھ کہنا چاہے تو اس ماحول اور ان مشاہدات و تجربات کے وہ اثرات جو اس کی زندگی کے ریشے ریشے میں سما چکے ہیں، اُس کی کوشش اور ارادے کے بغیر اُن کے لفظوں اور جملوں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ یہ حقیقت باغ و بہار، آرائشِ محفل، داستان امیر حمزہ، طوطا کہانی، بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، خرد افروز، اخلاقِ ہندی اور مذہبِ عشق میں سے ہر ایک میں نمایاں ہے۔

دوسری فنی حقیقت جو فورٹ ولیم کالج کی سب کتابوں کے مطالعے سے عموماً اور قصہ کہانی کی کتابیں پڑھ کر خصوصاً واضح ہوتی ہے، یہ ہے کہ مصنف کا ماحول اور مزاج اور اس کی شخصیت، اس کے اسلوبِ نگارش پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ میرامّن، حیدری، افسوس، حسینی، کاظم علی جوان اور مظہر علی خاں ولاؔ میں سے ہر ایک فورٹ ولیم کالج کے مقاصد کے پیشِ نظر سادہ نگاری کی طرف مائل ہے اور ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ اپنی سادگیٔ بیان میں روزمرّہ اور محاورے کی پابندی کرے لیکن اسلوب کے

معاملے میں اس بنیادی میلان کی پابندی کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا طرزِ نگارش اور اسلوبِ اظہار دوسرے سے نہیں ملتا۔ ارادتاً طریقۂ اظہار میں ایک مشترک انداز اختیار کر کے بھی یہ لکھنے والے اس معاملے میں بے اختیار ہیں کہ ان کا اسلوب خود بخود اُن کے مزاج اور ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تمام تصانیف اور خصوصاً ان کی قصّہ کہانیوں کی کتابیں اسٹائل کے فنی مفہوم اور اساس کی وضاحت کرتی ہیں۔۔۔

اضافات :

(۱)

"گلکرسٹ کی ایک تالیف" کے عنوان سے سید وقار عظیم کا ایک مختصر سا مضمون، اردو ڈائجسٹ، لاہور کے سالنامے (۱۹۶۴ء) میں شائع ہوا تھا جو فورٹ ولیم کالج کی ایک مطبوعہ کتاب "نقلیات" کے بارے میں ہے ــــ دو برس بعد ۱۹۶۶ء میں مجلس ترقیٔ ادب، لاہور کی جانب سے وقار عظیم صاحب کی مرتبہ کتاب "نقلیات" شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمے میں اُنہوں نے تفصیل کے ساتھ "نقلیات" کے مولّف کے بارے میں اظہارِ خیال کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے مولّف گلکرسٹ نہیں بلکہ میر بہادر علی حسینی ہیں۔ یہ دونوں نگارشات اپنی معنوی اور تحقیقی اہمیت اور زیرِ نظر کتاب سے قریبی موضوعی مناسبت کے پیشِ نظر یہاں محفوظ کی جا رہی ہیں۔

"نقلیات" کا خیال افروز اور معنی خیز انگریزی اختتامیہ گلکرسٹ کے قلم سے ہے جو ہدفِ کار سے اُن کے گہرے انہماک اور دل سوزی پر منظر ہے۔ اس اختتامیے کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کرنے کی خدمت وقار عظیم صاحب نے انجام دی تھی۔ "اضافات" کے تحت اسے بھی جزوِ کتاب بنا لیا گیا ہے۔

[مرتّب]

(۱)

گلکرسٹ کی ایک تالیف

فورٹ ولیم کالج میں تعلیم پانے والے نو وارد انگریز عہدیداروں کے لیے گلکرسٹ نے اپنے زمانے کے معروف ہندوستانی ادیبوں سے جو کتابیں لکھوائیں اُن میں بعض بہت مشہور ہوئیں اور آج بھی جب کوئی اُردو نثر کا جائزہ لینا شروع کرتا ہے تو ان کا نام نہ صرف اس لیے لیتا ہے کہ نثر کے ارتقا میں ان کی حیثیت تاریخی نقطۂ نظر سے اہم ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ان میں سے چند نے نثر نگاری کے ایک خاص اسلوب کی طرح بھی ڈالی اور اس اسلوب کا ایک واضح معیار بھی قائم کیا۔ میر امن کی "باغ و بہار" حیدری کی "آرائش محفل" حفیظ الدین احمد کی "خرد افروز" اسی طرح کی چند کتابیں ہیں۔

ان باقاعدہ تالیفات کے علاوہ اس دور میں بعض ایسی کتابیں بھی مرتب ہوئیں جو بظاہر تو لطیفوں اور چٹکلوں کے مجموعے ہیں لیکن اس لیے اہم ہیں کہ یہ چٹکلے اور لطیفے بڑے سیدھے سادے اور بے تکلف انداز میں اپنے عہد کی روزمرہ اور اس کے معاشرتی محاورے کا دلچسپ نمونہ پیش کرتے ہیں اسی طرح کی تالیف گلکرسٹ کی مرتب کی ہوئی کتاب "نقلیات" ہے۔

"نقلیات" کا جو نسخہ میرے پاس ہے اُس پر فورٹ ولیم کالج کی بنیادی مہر لگی ہوئی ہے۔ کتاب کا سائز ۱۸×۲۲/۸ ہے۔ اس میں ایک سو آٹھ نقلیں (یعنی چٹکلے، قصے اور لطیفے) شامل ہیں اور رومن، دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں چھاپے گئے ہیں۔ اُردو کا حصہ ایک صفحے کے غلط نامے سمیت ۶۵ صفحے کا ہے اور نستعلیق ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔ رومن میں یہ نقلیں ۵۳ صفحے میں اور دیوناگری میں غلط نامے سمیت

[پ]چاس صفحوں میں چھپی ہیں۔ رومن حصے کے فوراً بعد گلکرسٹ نے پانچ صفحوں میں ان کہانیوں [ـ]کے مقصد، ان کی زبان اور بعض الفاظ کے تلفظ اور اسلوبِ تحریر کے متعلق مختصر طور پر بعض [ب]ڑی پتے کی باتیں لکھی ہیں۔ مجموعے کی ۱۰۸ نقلوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے اُسے گلکرسٹ [ـ]نے ہندوستانی کا نام دیا ہے۔

نقلیات کے اکثر لطیفوں اور چٹکلوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ عام طور سے اُس روزمرہ کے مطابق ہے جو آجکل کے شہری معاشرے میں بولی جاتی ہے، البتہ کہیں کہیں [ت]ھوڑا سا فرق ہے اور یہ فرق بدیہی طور پر اس لیے ہے کہ اب سے تقریباً پونے دو سو برس [پ]ہلے کی روزمرہ میں بعض الفاظ بالکل اس طرح استعمال نہیں ہوتے تھے جیسے آج ہم انہیں [ا]ستعمال کرتے ہیں۔ مجموعے کی چند نقلیں (جو اس مجموعے میں نمبر ۱، ۲۰، ۲۴، ۲۵، ۲۸، [۳]۳ اور ۴۴ پر درج ہیں) پڑھ کر اس کے عام اسلوب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے)....

گلکرسٹ نے نقلوں کے انتخاب میں بعض باتیں خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھی ہیں۔ یہ [ن]قلیں عموماً بہت چھوٹی چھوٹی ہیں اور چند کو چھوڑ کر زیادہ ایسی ہیں جو دو تین چار سطروں [میں] ختم ہو گئی ہیں۔ انتخاب میں اس خصوصیت کے علاوہ دو اور باتیں بھی ہر نقل میں [نظ]ر آتی ہیں ایک یہ کہ ان میں کوئی نقل ایسی نہیں جس میں دلچسپی اور لطف کا کوئی نہ کوئی پہلو [نہ] ہو اور دوسرے یہ کہ ہر نقل دلچسپ ہونے کے علاوہ کسی نہ کسی اعتبار سے سبق آموز بھی [ہ]ے۔ نقل کو بیک وقت دلچسپ اور سبق آموز بنانے کے لیے ان میں جابجا کہاوتوں [او]ر شعروں سے کام لیا گیا ہے، شعروں سے نسبتاً کم اور کہاوتوں سے بہت زیادہ۔ ان [با]توں باتوں نے نقلوں کو کس طرح دلچسپ بھی بنایا ہے اور سبق آموز بھی، اس کا [اندا]زہ بعض (اُن نقلوں کو پڑھ کر کیا جا سکتا ہے) جو اس مجموعے میں ۱۵، ۱۶، ۱۷، [۳]۱، ۴۳، ۵۲، ۵۳ اور ۵۵ نمبر پر شامل ہیں۔

نقلیات میں لفظوں کی معنوی اہمیت کو عموماً پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس [کا نت]یجہ یہ ہے کہ بعض نقلوں میں محض الفاظ کے صَرف میں اہتمام کی بدولت لطف اور [ـ] پیدا ہوا ہے۔ مثلاً: (نقل نمبر ۴۵)

یوں تو کوئی نقل مزے سے خالی نہیں، مزا بھی دیتی ہے اور کوئی نہ کوئی سبق بھی سکھاتی ہے لیکن بعض نقلیں خصوصاً ایسی ہیں کہ ان کا مقصد محض تفننِ طبع ہے اور ان میں کہیں مزاح اور کہیں طنز اور مزاح کا مِلا جُلا رنگ باقی چیزوں پر حاوی اور غالب ہے۔ کتاب میں جو حکایتیں ۳۱، ۵۰ اور ۹۳ نمبر پہ درج ہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے قابلِ توجہ ہیں۔

نقلیات کی یہ ۱۰۸ نقلیں یا حکایتیں عام قاری کے لیے تو خیر دلچسپی کی چیز ہیں ہی لیکن زبان کے طالب علم کے لیے اس دلچسپ مجموعے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے تجزیے سے بعض دلچسپ اور کام کے نتیجے نکلتے ہیں اور وہ موضوع یقیناً محض ان نقلیات کے تعارف کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہے۔"

("سالنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء ص ۲۱۴-۲۱۷)

۲

مقدمہ: نقلیات

پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں ۲۸×۲۲/۸ تقطیع پہ چھپی ہوئی فورٹ ولیم کالج کی ایک کتاب ہے، جس کا نام "نقلیات" ہے۔ لائبریری کے کارڈوں میں اسے گلکرسٹ کی تالیف بتایا گیا ہے، لیکن چونکہ کتاب پہ کوئی سرورق نہیں، اس لیے پہلی نظر میں یہ فیصلہ دشوار ہے کہ کتاب واقعی کس کی مرتب کی ہوئی ہے۔ اس کے متعلق کسی قطعی نتیجے پر پہنچنے کے لیے ان معلومات پر نظر ڈالنی ضروری ہے جو گلکرسٹ کی تصانیف اور "نقلیات" نام کی کتاب کے متعلق مہیا کی گئی ہیں۔

محمد عتیق صدیقی نے اپنی کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں گلکرسٹ کی تصانیف کے تحت مندرجہ ذیل کتابوں کے نام لکھے ہیں:

۱۔ انگریزی ہندوستانی لغت۔
۲۔ ہندوستانی زبان کے قواعد
۳۔ ضمیمہ (لغت اور قواعد کا)
۴۔ مشرقی زبان دان۔
۵۔ The Anti Jargonist.
۶۔ نو ایجاد، یعنی نقشۂ افعال فارسی مع مصدرات آں و مترادف ہندوستانی۔
۷۔ Hindee Exercises.

۸- The Stranger's East India Guide to the Hindoostani.
or
Grand Popular Language of India.

۹- The Hindoostani Directory or Student's Introductor.

۱۰- The Hindee Principles.

۱۱- The Hindoostanee Manual or Casket of India.

۱۲- نقلیات ہندی

۱۳- The Oriental Fabulist.

۱۴- اتالیق ہندی یا Moral Preceptor

۱۵- The Hindee Arabic Mirror.

۱۶- The Hindee Roman Orthoepical Ultimatum.

اس فہرست کے خاتمے پر عتیق صاحب کا جو نوٹ شامل ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں :

"گلکرسٹ نے ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۴ء کے وسط تک مندرجہ بالا بارہ کتابیں تصنیف یا تالیف کر کے شائع بھی کیں۔ اس فہرست میں اگر اس کی ابتدائی مطبوعات بھی شامل کر لی جائیں تو یہ گنتی بڑھ کر سولہ ہو جاتی ہے۔ یعنی گلکرسٹ نے ہندوستان کے دورانِ قیام میں سولہ کتابیں مرتب کر کے شائع کیں اور یہ سب کی سب کتابیں لسانیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں[1]۔"

"گلکرسٹ اور اس کا عہد" کے صفحہ ۱۹۴ سے ۱۹۷ تک ۶۰ کتابوں کی وہ فہرست درج ہے جو گلکرسٹ نے ۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء کو کالج کونسل کے سامنے پیش کی۔ اس فہرست میں

۱- محمد عتیق صدیقی : گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ص ۱۹۲

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی ان کتابوں کے نام شامل ہیں جو ان کے نام سے متعارف ہو چکی ہیں۔ اس فہرست کے شمار نمبر ۱۳ اور ۱۵ پر مطبوعہ کتابوں کے ناموں میں یہ اندراج ہے :

۱۳- نقلیاتِ لقمانی (اُردو ہندی) تارنی چرن متر۔ مولوی امانت اللہ، میر بہادر علی حسینی، شیر علی افسوس۔ للو لال کوی۔

۱۵- نقلیات (جلد اول) اُردو، میر بہادر علی حسینی اور شمار نمبر ۲۹ پر زیر طبع کتابوں کے تحت یہ اندراج ہے :

۲۹- نقلیات (جلد دوم) میر بہادر علی حسینی۔

"۱۹۔ اگست ۱۸۰۳ء کو گل کرسٹ نے ہندوستانی مصنفین اور اُن کی تصنیفات کی طویل فہرست پیش کرتے ہوئے کالج کونسل سے سفارش کی کہ... کالج کی طرف سے ہندوستانی مصنفین کو انعامات دیئے جائیں[1]۔"

اس فہرست میں نقلیاتِ لقمانی، اور نقلیات (جلد اول) کی تفصیلات اس طرح درج ہیں :

نام کتاب،	صفحات،	رقم انعام،	مصنف :	کیفیت :
نقلیاتِ لقمانی	۳۰۰	۲۰۰	تارنی چرن متر مولوی امانت اللہ سدل مسر پنڈت میر بہادر علی حسینی میر شیر علی افسوس سری لال کب (للو لال کب) اور غلام اشرف	اول الذکر تین مترجمین خصوصیت کے ساتھ انعام کے مستحق ہیں کیونکہ بنگالی، عربی اور سنسکرت سے ترجمہ کرنے کا سارا بوجھ ان ہی پر تھا اور ان میں بھی تارنی چرن متر نے سب سے زیادہ محنت کی۔

۱- گل کرسٹ اور اس کا عہد : صفحہ ۱۶۷

نام کتاب:	صفحات:	رقم انعام:	مصنف:	کیفیت:
نقلیات جلد اوّل	۶۸	۲۰۰	میر بہادر علی	ہیڈ منشی (بہادر علی حسینی) نے اپنے مکان پر (فرصت کے اوقات میں) ان قصوں کو ترتیب دیا اور ترجمہ کیا۔ اس کام میں اور منشیوں سے بھی انہوں نے مدد لی ہے۔
نقلیات جلد دوم	۱۲۸	پریس میں		

ان تفصیلات کا مطالعہ کرنے کے بعد تین ایسی کتابوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں جن میں نقلیات کا لفظ آیا ہے:

"نقلیات ہندی"، "نقلیاتِ لقمانی" اور "نقلیات" جلد اوّل و دوم۔

"نقلیات" کے جس نسخے کا ذکر میں کر رہا ہوں، اس میں اُردو کا متن ۴۶ صفحے کا ہے۔ گل کرسٹ نے انعامات کے لیے کتابوں کی جو فہرست پیش کی ہے، اس میں نقلیاتِ لقمانی میں ۳۰۰ صفحات اور نقلیات جلد اول میں ۶۸ صفحات اور جلد دوم میں ۱۲۸ صفحات بتائے گئے ہیں۔ اس تفصیل کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب "نقلیاتِ لقمانی" ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس کا نام یا تو نقلیاتِ ہندی ہے (جیسا کہ گل کرسٹ کی تصانیف کے شمار نمبر ۱۲ میں درج ہے) یا 'نقلیات' جیسا کہ انعامات کی کتابوں والی فہرست میں لکھا گیا ہے۔ دوسری بات جو فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کی طویل فہرست کو دیکھ کر سامنے آتی ہے[1]، یہ ہے کہ اس میں 'نقلیاتِ لقمانی' اور 'نقلیات' جلد اوّل اور جلد دوم کے نام تو ملتے ہیں، لیکن نقلیاتِ ہندی کا نام موجود نہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نقلیات ہی وہ کتاب ہے جسے گل کرسٹ کی تصانیف کی فہرست میں نقلیاتِ ہندی کہا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کتاب کس کی مرتب کی ہوئی ہے؟ اس لیے کہ ایک

[1] گل کرسٹ اور اس کا عہد، صفحات ۱۹۳ تا ۱۹۷

طرف تو اس کا نام گلگرسٹ کی تصانیف کی فہرست میں درج ہے اور دوسری طرف بار بار یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کے مصنف یا مولف میر بہادر علی حسینی ہیں[1] اور اس کام میں انہوں نے دوسرے منشیوں سے بھی مدد لی ہے[2]۔

نقلیات کے جس نسخے کا ذکر میں کر رہا ہوں وہ رومن، دیوناگری اور فارسی رسم الخط میں چھپا ہے۔ رومن متن کے اخیر میں گلگرسٹ کا لکھا ہوا[3] تقریباً پانچ صفحوں کا ایک اختتامیہ (Postscript) شامل ہے جس کا آخری پیراگراف یہ ہے:

> The compiler embraces the opportunity, at the close of the First Volume, of returning his cordial thanks to those gentlemen, who have already contributed to this collection. He will take care to insert such tales as came too late for insertion now, in the Second Volume which will probably be published in all February 1803.

اس عبارت سے ایک طرف تو یہ بات ظاہر ہے کہ اس مجموعے میں جو نقلیات (Tales) شامل ہیں وہ کئی آدمیوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ بالکل یہی بات اس گوشوارے کے خانۂ کیفیت میں کہی گئی ہے جو مقدمے کے صفحہ ۵، ۶ پر پیش کیا گیا، لیکن اُلجھن میں ڈالنے والی یہ بات ہے کہ مذکورہ سطروں میں گلگرسٹ نے اپنے آپ کو مرتب (Compiler) کہا ہے۔ اس کے برخلاف اس نے ۹ (۱۹ ؟)[4] اگست ۱۸۰۳ء کو انعامات کی سفارش کرتے ہوئے

[1] گلگرسٹ اور اس کا عہد، صفحات ۱۷۰، ۱۹۴، ۱۹۵

[2] گلگرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۷۰

[3] اختتامیہ کے آخر میں کوئی نام درج نہیں، لیکن اس کے مطالب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گلگرسٹ کا لکھا ہوا ہے۔

[4] عتیق صاحب نے ایک جگہ ۱۹ اگست (صفحہ ۱۹۷) لکھا ہے اور دوسری جگہ ۹ اگست (صفحہ ۱۹۴) "گلگرسٹ اور اس کا عہد"

نقلیات کے مرتب کی حیثیت سے میر بہادر علی حسینی کا نام انعام کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نقلیات کے اصل مرتب میر بہادر علی حسینی ہیں اور انھوں نے اس کتاب کا اصل متن اُردو میں تیار کیا تھا، لیکن بالآخر یہ متن رومن اور دیوناگری رسم الخط میں بھی منتقل کیا گیا اور یہ تینوں متن یکجا کر کے چھاپ دیے گئے۔ اس خیال کی تائید اس نوٹ سے ہوتی ہے جو عتیق صاحب نے گلکرسٹ کی تصانیف کی فہرست پیش کرتے ہوئے 'نقلیات ہندی' کی تشریح کے سلسلے میں لکھا ہے[1]۔ اس نوٹ کے الفاظ یہ ہیں:

"یہ کتاب رومن، ناگری اور فارسی رسم الخط میں چھاپی گئی تھی۔ اس کی دو جلدیں تھیں: پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں اور دوسری ۱۸۰۶ء میں شائع ہوئی۔"

یہ کتاب جسے 'نقلیات' کے بجائے 'نقلیات ہندی' کہا گیا ہے، مرتب یا مولف کے نام کے بغیر چھپی ہے۔ لیکن رومن کے متن کے ساتھ جو اختتامیہ شامل ہے، وہ چونکہ گلکرسٹ کا لکھا ہوا ہے، اس لیے اسے حسینی کے بجائے گلکرسٹ کی تالیف سمجھ لیا گیا۔ قیاس کہتا ہے کہ کتاب اصل میں حسینی نے مرتب کی۔ ممکن ہے کہ دوسرے منشیوں کے علاوہ ترتیب کے سلسلے میں گلکرسٹ سے بھی مشورہ لیا گیا ہو۔ خاص کر نقلیات کو رومن رسم الخط میں منتقل کرنے کا کام گلکرسٹ ہی نے کیا ہو اور اسی لیے رومن متن کے آخر میں جو اختتامیہ شامل ہے اس میں اس نے اپنے آپ کو Compiler کہا۔

نقلوں کا زیرِ نظر مجموعہ 'نقلیات'، نقلوں کا وہی مجموعہ ہے جس کے متعلق عتیق صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ کتاب رومن، ناگری اور فارسی رسم الخط میں چھاپی گئی تھی۔"

اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب چھپی کس سنہ میں؟ گلکرسٹ کے یہ الفاظ کہ "کتاب کی دوسری جلد فروری ۱۸۰۳ء میں چھپے گی" ظاہر کرتے ہیں کہ نقلیات کی پہلی جلد فروری ۱۸۰۳ء سے پہلے چھپی، لیکن گلکرسٹ نے اپنے اختتامیہ کے آخر میں اپنی تحریر کی کوئی تاریخ درج نہیں کی اور کتاب کے سرورق کی غیر موجودگی میں اس کی طباعت و اشاعت کا صحیح مہینہ اور سال متعین نہیں کیا جا سکتا۔ عتیق صاحب لکھتے ہیں کہ اس

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ ۱۹۱

کی دو جلدیں تھیں، پہلی جلد ۱۸۰۲ء میں اور دوسری جلد ۱۸۰۶ء میں شائع ہوئی۔"

انعاموں کی سفارش والے ۹ اگست (۱۹۔ اگست) ۱۸۰۳ء کے خط کے حوالے کی رُو سے ۹ یا ۱۹ اگست تک 'نقلیات' کی پہلی جلد چھپ چکی تھی اور دوسری پریس میں تھی[1]۔ ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو گلکرسٹ نے حکومت کے چیف سیکرٹری مسٹر لمسڈن (Mr. Lumsden) کو کالج کی امداد کے سلسلے میں جو خط لکھا تھا[2] اس میں ان کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں جو اس وقت چھپ رہی تھیں۔ ان کتابوں میں نقلیات کی دو جلدیں بھی شامل ہیں[3]۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت پہلی جلد چھپ چکی ہو اور دوسری چھپ رہی ہو۔ اس لیے سنہ اشاعت کے متعلق عتیق صاحب کے بیانات (پہلی جلد ۱۸۰۲ء اور دوسری جلد ۱۸۰۶ء) میں سے پہلا تو قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن گلکرسٹ کے اختتامیے کے اس جملے سے کہ "دوسری جلد فروری ۱۸۰۳ء میں شائع ہو گی"، آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پہلی جلد اس سے چند مہینے پہلے چھپی ہو گی۔

'نقلیات' کے جس نسخے کو میں نے موضوعِ بحث بنایا ہے، اس کا سائز ۱۸×۲۲/۸ ہے اور جیسا کہ اس سے پہلے کہا گیا، یہ تین خطوں میں چھپا ہے: رومن، فارسی اور دیوناگری۔ کتاب میں ۱۰۸ نقلیں ہیں، رومن حصہ چالیس صفحوں کا ہے، ۳۵ صفحوں سے کچھ کم میں نقلیں ہیں اور پانچ صفحوں سے کچھ زیادہ میں گلکرسٹ کا اختتامیہ (Post-script) رومن حصے کے بعد اُردو کا متن ہے جو ۴۹ صفحوں کا ہے۔ اس کے بعد دیوناگری متن جو ۴۹ صفحوں کا ہے۔ تینوں متون میں سے رومن متن مکمل ہے۔ اردو متن کے چار صفحے (۳، ۴، ۵ اور ۶) غائب ہیں اس طرح اس میں پانچویں نقل کے نصف آخر سے تیرھویں نقل کے ابتدائی حصے تک کی عبارت موجود نہیں۔ دیوناگری متن کے ابتدائی آٹھ صفحے غائب ہیں اور یوں شروع کی ۲۱ نقلیں اور ۲۲ ویں نقل کا ابتدائی حصہ

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد، صفحہ ۱۷۰

[2] گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۸۰

[3] گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۸۲

اس متن میں موجود نہیں، لیکن چونکہ رومن اور دیوناگری خطوں کی عبارت لفظ بلفظ اُردو متن کے مطابق ہے، اس لیے متن مرتب کرنے میں مجھے کسی طرح کی وقت پیش نہیں آئی۔ تینوں متون کے آخر میں ایک غلط نامہ [رومن ERRATA، دیوناگری गलत नामा (غلط نامہ)] شامل ہے۔ اصل متن کو میں نے اس غلط نامے کے مطابق درست کر دیا ہے۔ کتاب دیوناگری متن کے صفحہ ۴۹ پر ختم ہوتی ہے۔ اس صفحے کی پشت خالی ہے۔ اگلا صفحہ غلط نامے کا ہے اس پر صفحے کا نمبر ۵۰ لکھا ہوا ہے۔ صفحہ ۵۰ کی پشت خالی ہے جس پر فورٹ ولیم کالج کی وہ بیضوی مہر ثبت ہے جو فورٹ ولیم کالج کی دوسری مطبوعات پر ثبت ملتی ہے۔

اردو متن نستعلیق ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔ کتاب کے ہر صفحے پر ۱۳ سطریں اور ہر سطر میں ۱۰ سے لے کر ۱۳ تک الفاظ ہیں۔ ٹائپ کے حروف اور جوڑ پوری طرح واضح ہیں اور کسی ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ جوڑنے میں کسی طرح کی دقّت کا سامنا نہیں ہوتا، یہاں تک کہ بعض اوقات دو دو لفظوں کو بغیر کسی ضرورت کے آپس میں جوڑ دیا گیا ہے۔ اس طرح کے جوڑوں میں جہاں ایک طرف بالکل سیدھے سادے الفاظ کا جوڑ شامل ہے (جیسے کریگا، دیکر، اُنکو، اُسنے، تمکو، کسکا، لیگیا وغیرہ) وہاں ایسے الفاظ کو بھی مرتب کر دیا گیا ہے جنہیں آپس میں جوڑنا دقت سے خالی نہیں۔ مثلاً دنونمیں (دنوں میں) آپسمیں، اسواسطے، باربرداریکا (باربرداری کا) جھوںپڑیکو (جھونپڑے کو)، لوگونسے (لوگوں سے)، آدمیونسے (آدمیوں سے)، نظرونکا، رفیقونمیں، سپاہیونمیں (سپاہیوں میں)، ہندوستانمیں (ہندوستان میں)، لگچلا (لگ چلا) وغیرہ۔ دو الفاظ کے آپس میں جوڑ کر چھاپنے میں کسی طرح کا اہتمام ملحوظ نہیں۔ وہی الفاظ جو ایک جگہ ملا کر لکھے گئے ہیں کسی دوسری جگہ الگ الگ بھی لکھے اور چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ مثلاً اُس نے، تم نے، اُس کو، کس واسطے، کے واسطے، ہندوستان میں وغیرہ۔

جس طرح حروف اور الفاظ کو الگ الگ یا ملا کر لکھنے کے سلسلے میں کسی طرح کا اہتمام نہیں، اسی طرح اوقاف سے کام لینے کی کوشش کے باوجود ان کے استعمال میں

کسی قاعدے یا اصول کی پابندی نظر نہیں آتی۔ کھڑی اور پڑی لکیر (ا ـ) کو جابجا پورے وقفے (Full stop) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، لیکن اکثر جگہ یہ صورت پیش آئی ہے کہ جہاں کسی جملے یا عبارت کے بعد وقفے کی علامت کا ہونا ازبس ضروری ہے، اس لیے کہ اس کے بغیر مفہوم بھی واضح نہیں ہوتا اور بات کا وہ زور بھی ظاہر نہیں ہوتا جو لکھنے والا پیدا کرنا چاہتا ہے، وہاں یہ علامت موجود نہیں۔ کہیں کہیں استفہام اور استعجاب کی علامتیں (؟ !) بھی استعمال کی گئی ہیں، لیکن ان کے استعمال میں کسی طرح کی باقاعدگی یا التزام سے کام نہیں لیا گیا۔ اہتمام اور التزام اگر ہے تو اعراب کے استعمال کے معاملے میں کہ اس التزام کے بغیر لفظوں کے صحیح تلفظ کا پتا نہیں چلتا اور جن انگریز پڑھنے والوں کے لیے یہ نقلیں مرتب کی گئی ہیں ان کے نقطۂ نظر سے اشد ضروری ہے کہ اعراب کے ذریعے لفظوں کے تلفظ کی وضاحت کی جائے۔ چنانچہ اس معاملے میں پورا اہتمام اور التزام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ 'ے' 'و' اور 'ن' کے استعمال میں اس اہتمام کی کس حد تک پابندی کی گئی ہے، اس کا اندازہ کچھ مثالوں کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

(الف) 'ے' کی ایک آواز وہ ہے جو 'ایک' اور 'نیک' کے لفظوں میں نکلتی ہے۔ اس آواز کو ظاہر کرنے کے لیے نقلیات کے متن میں 'ے' کے اوپر ایک چھوٹا سا حلقہ بنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر متن میں ذیل کے الفاظ آئے ہیں اور ان میں ہر جگہ آواز کو واضح کرنے کے لیے یہ علامت (ہ) استعمال کی گئی ہے:

اَیک - دیرے - کریگا - میری - میں - سکینے - کلیئوا
نیک - فریب -

(ب) دوسری آواز وہ ہے جو ایسا اور جیسا کی 'ے' میں نکلتی ہے۔ اس آواز کے لیے جزم کا نشان (ْ) استعمال ہوا ہے، جیسے ذیل کے لفظوں میں:

ایسا - پیدا - لیلیٰ - پیچھے - خیرخواہی وغیرہ -

(ج) کیا (فعل ماضی) اور کیا (حرف استفہام) کے فرق کو ظاہر کرنے کے لیے کیا (حرف استفہام) کی 'ی' کے نیچے ایک لمبی لکیر کھینچی گئی ہے جیسے کیا۔ اسی طرح کیوں کو کیوں لکھا گیا ہے۔

(د) کھائے، جائے جیسے لفظوں کو بغیر ہمزے کے لکھا گیا ہے۔

(ڈ) آئیے، جائیے وغیرہ میں کبھی ء اور دو نقطے استعمال کیے گئے ہیں اور کبھی صرف ء۔ جیسے دلوادئے یا دلوادیئے۔

(و) 'ھے' کو ہر جگہ 'ھی' لکھا گیا ہے۔

(i) لفظوں کے بیچ میں آنے والے 'و' کی تین آوازوں کو بھی ہر جگہ پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً 'اَور'، 'دَولت'، 'نَوکر'، 'مَوسم'، 'کَون'، 'شَوق' اور اَوسان میں واؤ کے اوپر جزم کی علامت لگائی گئی ہے، جیسے اوْر، دوْلت، نوْکر، موْسم، کوْن، شوْق، اوْسان، اوْقات، فوْجدار وغیرہ۔

(ii) کو، تو، جو اور اس قبیل کے لفظوں میں آنے والے واؤ پر ویسا ہی حلقہ بنایا گیا ہے جیسا ایک اور نیک کی 'ی' پر جیسے کوْ، توْ، جوْ، ہوْگیا، کوْئی، تھوْڑا، جھوْنپڑا، پڑوْسی، مشغوْل، گوْشت اور بھوْجن وغیرہ۔

(iii) توُ، پوُچھا اور خوُب جیسے لفظوں میں 'و' پر کوئی علامت نہیں لگائی گئی۔

تشدید :

مشدّد الفاظ پر تشدید ہمیشہ اہتمام کے ساتھ لگائی گئی ہے اور اس میں آسان، مشکل اور مانوس وغیر مانوس کے درمیان امتیاز نہیں کیا گیا۔ مثلاً متن میں ذیل کے الفاظ پر تشدید لگائی گئی ہے:

رعیّت، نیّت، کُتّے، پرمیشّر، اتّفاقاً، نوّاب، دُکھّن، تاسّف

متردّد۔

ہ یا الف :

اُردو میں بعض لفظوں کے املا کے معاملے میں ہمیشہ سے اختلاف رہا ہے۔ ایسے لفظوں میں خصوصیت کے ساتھ وہ لفظ شامل ہیں جن کے آخر میں الف کی آواز نکلتی ہے۔ لیکن اکثر اوقات اُنھیں الف کے بجائے 'ہ' پر ختم کیا جاتا ہے، جیسے راجہ اور لالہ وغیرہ۔ نقلیات میں اس طرح کے لفظوں کو 'الف' پر ختم کیا گیا ہے اور راجا، لالا، لکھا گیا ہے۔ مُلّا دوپیازہ کے نام کو بھی الف پر ختم کیا گیا ہے۔ بعض اوقات فارسی کے ایسے الفاظ کو بھی جو 'ہ' پر ختم ہوتے ہیں، 'الف' پر ختم کیا گیا ہے، جیسے ایک نقل میں 'تکیہ' کو 'تکیا' لکھا گیا ہے۔

'ہ' کا اِمالہ

'ہ' پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد حرف جار آئے تو بولنے میں 'ہ' کی آواز بن جاتی ہے، لیکن بعض علاقوں میں اس آواز کو بدلا نہیں جاتا، بلکہ لفظ جس طرح لکھا گیا ہے اسے امالے کا لحاظ رکھے بغیر اسی طرح بولا بھی جاتا ہے۔ مثلاً "معاملہ میں" کو "معاملا میں" کہا جائے گا، "معاملے میں" نہیں۔ 'نقلیات' میں بعض موقعوں پر 'ہ' کو بدل کر 'ے' کی صورت دی گئی ہے اور یوں لفظ کو ادا کرنے کے معاملے میں کسی طرح کی غلط فہمی کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ مثلاً نقل نمبر ۳۹ میں یہ جملہ آتا ہے:

"اس معاملے میں فائدہ بہت ہے جو میرا گوشت بچے۔" اسی طرح نقل نمبر ۶۸ کی ابتدائی عبارت یہ ہے "ایک آزاد نے حبشی سے سوال کیا،" اوپر کو بلے کی صورت؛ لیکن اس اصول کے استعمال میں نہ التزام برتا گیا ہے، نہ احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض جگہ جہاں اس طرح کا اِمالہ ضروری تھا اس سے کام نہیں لیا گیا۔ مثلاً نقل نمبر ۷۱ کی، اس عبارت میں "ایک جولاہا یہ خبر سُنتے ہی اپنے گرگھر سے اُٹھ کر اُس کوچے میں آیا۔" اس جملے میں جس طرح کوچہ کو "کوچے" لکھا گیا ہے اسی طرح "کرگھہ" کو "کرگھے" لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ مثال تو التزام قائم نہ رکھنے کی

ہے۔ اب ایک مثال ایسی دیکھیے جہاں امالہ ہرگز درست نہیں۔ نقل نمبر ۲۲ کا پہلا جملہ ہے : ایک فقیر کسی عمدے کی ڈیوڑھی میں گیا"۔ یہاں 'عمدے' کی جگہ عمدہ ہونا چاہیے تھا۔

تلفظ اور املا کی مطابقت :

بعض لفظ ایسے ہیں جنھیں ہم تلفظ کے مطابق نہیں لکھتے : لوہار اور جولاہا اسی طرح کے لفظ ہیں۔ بول چال میں ان دونوں لفظوں کے 'واو' میں صرف پیش کی آواز نکلتی ہے، اس لیے پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے انھیں لُہار اور جُلاہا لکھنا چاہیے۔ 'نقلیات' میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے ہیں اسی طرح لکھے گئے ہیں۔

ن غنّہ :

ن غنّہ پر ختم ہونے والے بعض لفظوں میں ن غنہ سے پہلے ا، و یا 'ے' آتے ہیں۔ ایسے لفظوں میں بعض اوقات 'ں' کی آواز ادا نہیں کی جاتی ہے اور اس لیے بعض اوقات تحریر میں بھی اسے لکھا نہیں جاتا۔ ایسے کئی لفظوں کی تحریر میں نقلیات میں 'ں' نہیں لکھا گیا۔ مثلاً نقل نمبر ۳۲ میں "ماں کا مال" کو 'ما کا مال' لکھا گیا ہے، نقل نمبر ۲۱ میں پاؤں کو 'پانو'[1] لکھا گیا ہے اور کئی نقلوں میں دونوں کو دونو اور کنوئیں کو کنوے۔

اُردو میں فارسی اور عربی کے بہت سے لفظ ہیں، جن کے تلفظ کے معاملے میں بڑی بے احتیاطی برتی جاتی ہے۔ 'نقلیات' میں اس طرح کے لفظوں پر بڑے اہتمام کے ساتھ اعراب لگائے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض لفظ متن میں کئی کئی مرتبہ استعمال ہوئے ہیں، لیکن اعراب ہر جگہ لگے ہوئے ہیں۔ اس طرح کے چند لفظ یہ ہیں :

مُصاحِب ۔ سُوال ۔ صاحِب زادہ ۔ خَجِل ۔ مُطالعہ ۔ سَوار

نوّاب ۔ دِہقان ۔ مَجنوں ۔ موجِب ۔ عِتاب ۔

اپنے انگریزی کے 'اختتامیہ' میں گل کرسٹ نے رُوپے کے لفظ کے علاوہ بعض

---

[1] بعض جگہ اسے 'پاؤں' بھی لکھا گیا ہے (دیکھیے نقل ۱۰۲)

اور لفظوں کے مختلف تلفّظوں کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ 'نقلیات' کے متن میں ایسے لفظوں کے مختلف تلفظ استعمال کیے گئے ہیں۔ چناں چہ نقلیات کی مختلف نقلوں میں روپے کے لفظ کی جو مختلف صورتیں ملتی ہیں وہ یہ ہیں :

روپیا ۔ رُوپیا ۔ رُوپئے ۔ رُوپیوں کا توڑا ۔ رُوپے ۔

'نقلیات' کے متن میں بعض لفظ اس طرح لکھے گئے کہ ان میں بظاہر کسی اصول کی پابندی نظر نہیں آتی۔ ایسے لفظوں میں جن، ان اور سامنے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنھیں متن میں ہر جگہ جنھ، اُنھ اور سامنھے لکھا گیا ہے۔ جن مصادر میں علامتِ مصدری (نا) کے پہلے ن آیا ہے، ان کے لکھنے میں یکسانی نہیں برتی گئی، مثلاً ایک جگہ ماننے کو مانتے لکھا گیا ہے۔ یہ لفظ نقل ۹۵ کی اس عبارت میں آیا ہے : "جب اُس نے دیکھا کہ یہ عقل کا اندھا ماننے کا نہیں، ایک ڈلا صابن کا حوالے کیا"۔ اسی طرح کا ایک مصدر پہچانتا ہے۔ نقل نمبر ۴۴ میں "پہچاننے کے واسطے" کو "پہچان نیکے واسطے" لکھا گیا ہے۔ عبارت کا ٹکڑا ہے "نیک بد کے پہچان نیکے واسطے"۔

زبان و بیان :

"نقلیات" کے مرتب کرنے کا مقصد نووارد انگریز افسروں کو ہندوستان کی عام اور ہر دلعزیز زبان سے واقف کرنا ہے۔ اس مقصد میں املا اور تلفظ سکھانے کی اہمیت مسلم ہونے کے باوجود محض فروعی اور ثانوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تلفظ اور املا کے پہلو سے ہٹ کر جب ہم "نقلیات" کا تجزیہ زبان و بیان کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں تو بہت سی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ان نقلوں میں عام طور سے جو زبان استعمال کی گئی ہے اس میں غیر مانوس اور خصوصیت سے متروک الفاظ اور محاورے استعمال کرنے سے اجتناب کیا گیا ہے، اور زبان کو بامحاورہ، ٹکسالی، روزمرہ کے زیادہ سے زیادہ قریب رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس مجموعے کی ۱۰۸ نقلوں میں سے ۲۳ ایسی ہیں جن کی زبان کو دیکھ کر یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ یہ حکایتیں اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان نقلوں کی زبان و بیان کی عام شستگی

اور صفائی سے قطع نظر لفظوں کی دروبست، جملوں کی ساخت اور ترتیب میں کہیں کسی طرح کا اُلجھاؤ نہیں، اس لیے جو بات کہی گئی ہے وہ فوراً ذہن نشین بھی ہو جاتی ہے اور طبیعت میں انبساط کی کیفیت بھی پیدا کرتی ہے، جو بات کہنے اور بات سننے والے کی ہم زبانی سے پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تین نقلیں پیش کی جاتی ہیں:

نقل ۱

ایک بادشاہ نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ سب سے بہتر میرے حق میں کیا ہے؟ عرض کی کہ عدل کرنا اور رعیت کا پالنا۔

نقل ۴۳

ایک شخص مٹھی میں گیہوں لیے جاتا تھا۔ کسی نے پوچھا تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ بولا "جانِ آدم"۔ اس نے کہا "دکھیوں"۔ اُس نے دکھا دیے۔

نقل ۸۶

ایک غلام جاڑے کے موسم میں اپنے میاں کے پیچھے مارے سردی کے کانپتا چلا جاتا تھا۔ ایک بھلے مانس نے اسے دیکھ کر کہا کہ تو جو اتنی ٹھنڈ کھاتا ہے، اپنے میاں سے کیوں نہیں کہتا۔ وہ بولا "کیا میاں کے آنکھیں نہیں ہیں جو میں کہوں"۔

زبان میں زیادہ سے زیادہ صفائی اور شگفتگی پیدا کرنے اور پڑھنے والوں کے لیے موثر اور دل نشین بنانے کے لیے 'نقلیات' کے مصنفوں یا موئفوں نے لفظوں کے استعمال میں عموماً یہ اہتمام کیا ہے کہ انھیں تحریری زبان کے بجائے گفتگو کی زبان کے قریب رکھیں اور نقلوں میں ہر جگہ لفظوں کی وہ صورت استعمال کریں جو بول چال اور روزمرہ کے مطابق ہے۔ نقل نمبر ۸۶ میں 'آقا' کے لفظ کے بجائے 'میاں' کے لفظ کا استعمال اسی رجحان کی مثال ہے۔ بعض اور مثالیں ذیل کے جملوں اور فقروں میں ملیں گی:

ایک عورت بے وقوف اپنے پھوہڑپنے سے چلتے ہوئے گر گر پڑتی تھی۔ (نقل ۷)

کمینہ دولت مند ہوتے ہی نجیب زادے سے آنکھیں لگا چرانے۔ (نقل ۲۱)

کسی نے کتے سے پوچھا کہ تو رستے میں کیوں پڑا رہتا ہے۔ (نقل ۴۷)

کئی آدمیوں کو کنارے پر دیکھ کر لگا پکارنے کہ اربے یارو! (نقل ۵۲)

کہا میرا اونٹ کھو یا گیا۔ (نقل ۶۱)

ایک سمرقندی، بڑی داڑھی والا۔ (نقل ۶۶)

ایک مغل، ولایت زا، ہندوستان میں آکر بڑا آدمی ہوا۔ (نقل ۷۲)

ایک عرب کی دو لونڈیاں تھیں، ایک ثیبہ، خوبصورت۔ دوسری باکرہ، بدصورت۔ (نقل ۸۱)

ایک مسافر اس کے پاس آبیٹھا۔ لگا کھانے۔ (نقل ۸۲)

ایک موٹے لنگڑے نے ایک دُبلے پتلے کو پکڑ خوب سا مارا۔ (نقل ۸۳)

شہر کے باہر میدان میں ایک زمیندار حرام زادہ ایک لاٹھی لیے کھڑا تھا۔ (نقل ۸۸)

اس نے کہا دوست! تیرے ہاتھ پاؤں کی ملائمت سے معلوم ہوتا ہے۔ (نقل ۱۰۲)

جتنا پکوایا تھا سب کا سب کھا گئے۔ (نقل ۹)

یہ لگا انھیں چُن چُن کھانے۔ (نقل ۹۶)

بھونروں کو لگا چبانے۔ (نقل ۹۶)

جب منہ میں لگے کچر کچر کرنے۔ (نقل ۹۶)

آج فلانے بادشاہ نے دُنیا سے رحلت کی۔ (نقل ۲۳)

پوچھا کہ یہ کس کا لڑکا ہے جو اتنا آوارہ ہے، اُس نے کہا "فلانے کا"۔ (نقل

غلام سے کہا کہ فلانے حکیم کے پاس جاکر دوا لا۔ (نقل ۷۱)

ایک مہاجن کی روکڑ کہیں کو جاتی تھی۔ رستے میں قزاقوں نے مار لی۔ (نقل ۸۹)

ایک شخص اس کے جان پہچانوں میں سے وہاں آنکلا۔ (نقل ۵۵)

اوپر کی مثالوں میں خط کشیدہ لفظوں اور ٹکڑوں میں طرح طرح سے روزمرہ کی بے تکلفی پیدا کی گئی ہے اور ایک لفظ کو چھوڑ کر دوسرا لفظ استعمال کرکے یا جملوں میں لفظوں کی ترتیب بدل کے انھیں عام بول چال کی زبان سے قریب لایا گیا ہے۔ یہ بات ایک اور طریقے سے بھی پیدا کی گئی ہے۔ مجموعے کی زیادہ نقلوں میں واقعات اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ معاشرتی زندگی کی مختلف سطحوں کے کردار ایک دوسرے سے خطاب کرتے ہوئے ملتے ہیں اور اندازِ تخاطب میں ہر جگہ حفظِ مراتب کے علاوہ موقع محل کی مناسبت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ یہ روزمرہ کے سکھانے کا بڑا دلچسپ اور موثر طریقہ ہے۔ گفتگو کے

موقع پر لوگوں کے مرتبے اور منصب کی مناسبت سے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں، انھیں مختلف حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً لفظوں کی ایک شق اُن افعال کی ہے جن سے پوچھنے اور بولنے کا مفہوم ادا ہوتا ہے۔ 'نقلیات' کی مختلف نقلوں میں ان افعال کی جو مختلف شکلیں ملتی ہیں وہ یہ ہیں۔

= پوچھا۔ پوچھنے لگا۔ سوال کیا۔ دریافت کیا۔

= کہا۔ کہہ دیا۔ کہنے لگا۔ بولا۔ بول اُٹھا۔ عرض کی۔ عرض کیا۔ گزارش کی۔ خدمت میں عرض کی۔ حضور میں عرض کی۔ حضور میں آکر عرض کی۔ خدمت میں آکر کہنے لگا۔ فرمایا۔ ارشاد کیا۔ حضرت نے فرمایا۔

= درست! واہ واہ! استغفراللہ! سبحان اللہ! کیا خوب! اے وائے وائے۔

= بابا! او بابا! اچھا بابا! او بابا سیفو!
خداوند! کہو حضرت! آیئے حضرت! جہاں پناہ! عالم پناہ! حضرت سلامت! صاحب! ہاں مہربان! قبلۂ عالم! اے عزیز! بھیا جی! آغا صاحب! مہاراج! پرتھوی ناتھ! مرزا جی! حکیم جی! کیوں ساہو جو! کیوں مرزا صاحب! کہو مرزا جی! کہو بیٹا! کہو صاحب! اے کمبخت! اے بے وحدت! بی بیو! اچھا بیٹھو! ہاں! میں یہی چاہتا ہوں۔

مبتدی غیر ملکیوں کو زبان سکھانے کے سلسلے میں بعض اور اہتمام اور التزام کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ لفظوں میں بار بار اور کثرت کے ساتھ مرادفات کا استعمال ہوا ہے۔ مختلف نقلوں میں جو مرادف لفظ بار بار آتے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

عدل۔ عدالت۔ انصاف

دولت۔ روکڑ

عمدہ۔ امیر۔ دولت مند

محتاج ۔ غریب ۔ کنگال ۔ مفلس
دانا ۔ عقلمند
خفا ۔ ناخوش ۔ برہم ۔ آزردہ ۔ رنجیدہ ۔ چیں بجبیں
دم کھا رہا ۔ چپ ہو رہا ۔ دم بخود ہو رہا
شرمندہ ۔ خجل
اندھا ۔ نابینا
اچنبھا ۔ تعجب
راہی ۔ مسافر
سُوم ۔ بخیل
آقا ۔ میاں
قیمت ۔ مول
شکم ۔ پیٹ
نالش کی ۔ نالشی کی
خوب ۔ اچھا ۔ بہتر
فقیری ۔ گداگری
مُتَرَدِّد ۔ پریشان خاطر
فرق ۔ تفاوت
تقصیر ۔ قصور
حصّہ ۔ بخرا
عزیز ۔ یار ۔ آشنا ۔ دوست
خو ۔ عادت
مطلق ۔ بالکل

ان نقلوں میں مرادفات کی اہمیت پر جتنا زور دیا گیا ہے اس کا اندازہ اوپر کی مثالوں

سے کہیں زیادہ اُن پانچ نقلوں (نقل ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰) سے ہوتا ہے جن میں ایک ہی نقل الفاظ بدل کر پانچ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے۔ الفاظ کا فرق مندرجہ ذیل گوشوارے سے اچھی طرح سامنے آجائے گا:

نقل ۷۶	۷۷	۷۸	۷۹	۸۰
پرتھوی پت	راجا	سلطان	بادشاہ	بادشاہ
پتر	لڑکا	لڑکا	لڑکا	فرزند
گرو	جوتکی	معلّم	آخون	معلّم
سونپیو	سونپا	حوالے کیا	سپرد کیا	سونپا
جوتش بِدیا	جوتک	علم نجوم	ستارہ شناسی	علم نجوم
نِپون	پورا	کامل	پختہ	لاثانی
نِکٹ	پاس	پاس	پاس	حضور میں
پرشرم	دُکھ	—	محنت	محنت
کرپا	پیار	شفقت	پیار	شفقت
پرکار	باتیں	مدارج	باریکیاں	مراتب
بِدیا	—	علم	—	علم
اچھی بھانت	اچھی طرح	اچھی طرح	بخوبی	خاطر خواہ
نپیں جان چکو	بڑا گنی ہوا	ماہر ہوچکا	دستگاہ پیدا کی	خوب مہارت ہوچکی
سنکھ	سامنے	حضور میں	—	حضور میں
نویدن کیو	کہا	عرض کی	گزارش کی	عرض کی
پری پک	چوکس	فائق	یگانۂ روزگار	لائق و فائق
پریکشا	جانچ	امتحان	آزمائش	امتحان
مریادسوں	ہاتھ جوڑکے	آداب بجالایا	بندگی بجالایا	آداب بجالایا
ٹھاڑو رہیو	کھڑا رہا			

نرپت	راجا	مُلک	بادشاہ	حضرت
مندری	انگوٹھی	انگوٹھی	انگوٹھی	انگوٹھی
کر	ہاتھ	مُٹھی	مٹھی	مٹھی
چھدر	چھید	—	سوراخ	سوراخ
پاکھان	پتھر	پتھر	سنگ	پتّھر
نام	ناؤں	اسم	نام	نام
اور	اور	طرف	—	طرف
بھوپت	مہاراج	حضرت	جہاں پناہ	عالم پناہ
بِنتی کیو	ہاتھ جوڑ کر بولا	عرض کی	ہاتھ باندھ کر کہا	عرض کی
پرتھوی ناتھ	مہابلی	قبلۂ عالم	جہاں پناہ	خداوند
بِدیا	گُن	علم	ہُنر	علم
گھات	دوس	قصور	کوتاہی	نُقص
بُدھی	مت	عقل	دانائی	عقل
بھول	چوک	نقصان	کمی	کوتاہی

ان پانچ نقلوں کے ہم معنی یا قریب المعنی لفظوں کو دیکھ کر اوّل تو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں نے کسی خاص ہدایت یا منصوبے کے مطابق ایک ہی نقل یا کہانی میں لفظوں کو بدل بدل کر ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں زبان سیکھنے والے کے لیے ایک بات کے ادا کرنے کی غرض سے مختلف الفاظ اور محاورے بھی مہیا کیے ہیں اور مختلف اسالیب بھی۔ الفاظ کی اس فہرست کو دیکھ کر، اور جن جملوں میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، انھیں ایک دوسرے کے مقابل میں رکھ کر بدیہی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں مشکل اور غیر مانوس الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جملوں میں بھی تکلف پیدا ہو گیا ہے اور یہ بات خصوصیت سے پہلی نقل میں محسوس ہوتی ہے۔ جن نقلوں میں سنسکرت کے لفظوں کے بجائے فارسی کے لفظ ہیں، ان میں روانی بھی ہے اور ان سے نقل

یا حکایت کی پوری فضا میں زندگی کا رنگ بھی پیدا ہوتا ہے اور دلچسپی بھی۔ اسی بات سے ایک تیسری بات یہ نکلتی ہے کہ مرادفات کے استعمال میں ایسے لفظوں کی تکرار کی گئی ہے جو عام بول چال اور روزمرہ کا حصہ بن گئے ہیں۔ ایسے لفظ نقل کے مختلف متنوں میں سامنے آتے ہیں تو ان کی یہ اہمیت واضح ہوتی ہے کہ عام بول چال یا روزمرہ کا جزو ہونے کی وجہ سے وہ ہر طرح کی عبارت میں کھپ جاتے ہیں، مثلاً بادشاہ، لڑکا، معلم، سپرد کیا، سونپا، علم نجوم، پاس، محنت، پیار، شفقت، اچھی طرح، امتحان، آداب بجالایا، انگوٹھی، سوراخ، پتھر، نام، اور، طرف، عرض کی، علم، عقل، کوتاہی۔ ان سب لفظوں کو ان لفظوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیے جن پر انھیں ترجیح دی گئی ہے تو ان کی معنوی افادیت اور اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ بادشاہ، پرتھوی پت، راجا اور سلطان پر قابلِ ترجیح ہے۔ لڑکا، پُتر اور فرزند کے مقابلے میں زیادہ وسیع الاستعمال ہے۔ علم نجوم، ستارہ شناسی اور جوتک کے مقابلے میں ہر سیاق میں استعمال ہونے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ پاس، محنت، پیار، شفقت، اچھی طرح، امتحان، آداب بجالایا، انگوٹھی، سوراخ، پتھر، نام، طرف، عرض کی، علم، عقل اور کوتاہی آسان، عام فہم، روزمرہ کے الفاظ ہونے کے علاوہ شستہ اور شائستہ بھی ہیں۔

زبان سکھانے اور طالب علموں کے لیے ۸۔۱۰ نقلوں میں زیادہ سے زیادہ الفاظ مہیا کرنے کی کوشش کا اظہار نقلیات میں ایک اور طرح بھی ہوتا ہے۔ نقلوں میں جہاں کہیں بھی ممکن ہوا ہے فارسی، عربی کے الفاظ بے تکلفی کے ساتھ عبارتوں میں لائے گئے ہیں، چنانچہ خیر خواہی، بالعکس، قضا کار، گرد و پیش، بار ور، برحق، متکبر، متردد، برہم، آزردہ، خجل، تفاوت، تقصیر، فیصل جیسے الفاظ بڑی بے تکلفی اور روانی کے ساتھ نقلوں میں آئے ہیں، لیکن کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ فارسی اور عربی کے یہ الفاظ جس جگہ استعمال ہوئے ہیں ان کے مقابلے میں اس طرح کے زیادہ مانوس الفاظ سے کام چل سکتا تھا جو روزمرہ سے زیادہ قریب ہوں۔ ذیل کے جملوں کے خط کشیدہ الفاظ اسی طرح کی مثالیں ہیں:

۱۲ سپاہی آپس میں کسی شہر کے کوچے میں خانہ جنگی کر رہے تھے۔ (نقل ۱۰)

ایک فقیر کسی عمدے کی ڈیوڑھی پہ گیا اور گالیاں دینے لگا۔ وہ دولت مند ہرگز چیں بجبیں نہ ہُوا (نقل ۲۲)

قاضی شرمندہ ہو، دم بخود ہو رہا (نقل ۲۷)

بی بیو! اس صورت پر یہ بجزا مانگتی ہے[1] (نقل ۳۲)

کسی عورت نے شاتستگی سے اپنے خاوند کے خط میں یہ دوہا لکھا (نقل ۴۱)

دو شخص آپس میں متفق ہو کر روزگار کے واسطے کسی ملک کو چلے جاتے تھے (نقل ۴۹)

تھوڑے دنوں میں دروبست اُڑا دیا (نقل ۴۹)

ایک کائستھ بیکاری کے سبب سے نہایت مُتردّد تھا۔ ایک نے اس سے پوچھا کہ تو اتنا پریشان خاطر کیوں ہے[2] (نقل ۹۸)

صاف کہو جو میری فہمید میں آوے[3] (نقل ۱۰۶)

---

[1] اس نقل میں ایک جملے میں 'حصہ' کا لفظ آیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ لکھنے والے نے آگے چل کر 'بجزا' استعمال کیا ہے۔

[2] یہاں بھی 'پریشان خاطر' استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے جملے میں متردّد آ چکا ہے۔

[3] فارسی پسند کائستھوں کی اُردو کے جو نمونے تفریحِ طبع کے طور پر بنائے جاتے ہیں، یہ جملہ اُن میں ایک دلچسپ اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

شاہ کو یہ لطیفہ پسند آیا اور حاکم کو تغیر کیا (نقل ۶۷)

کہاوتیں :

ضرب الامثال کسی زبان کے مزاج اور اس کے معاشرتی اور تہذیبی ماحول کا عکس ہونے کے علاوہ بات کی تاثیر میں اضافہ کرنے اور اسے قابلِ قبول اور دل نشین بنانے کا بڑا کارگر وسیلہ سمجھی جاتی ہیں۔ نقلیات کے مرتب یا مرتبین نے اس بات کی اہمیت کو اس حد تک محسوس کیا ہے کہ نقلیات کی ۱۰۸ نقلوں میں سے ۵۰ ایسی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی ضرب المثل استعمال کی گئی ہے یا کوئی ایسا دوہا یا شعر، جس کی حیثیت ضرب المثل کی ہے۔ ان ضرب الامثال میں ۳۴ خالص اُردو کی ہیں، ۹ ہندی کی، دو پنجابی کی اور ۵ فارسی کی۔ شروع کی کہاوتیں نسبتاً آسان ہیں، مشکل اور پیچیدہ کہاوتیں بعد میں آنے والی نقلوں میں استعمال کی گئی ہیں۔ ہندی، فارسی اور پنجابی کی صرف وہی کہاوتیں استعمال کی گئی ہیں جو آسان بھی ہیں اور جن کی عام زندگی میں زیادہ ضرورت پیش آنے کا امکان ہے۔ کہاوتوں کے علاوہ بعض نقلوں میں (ایسی آٹھ نقلیں ہیں) فارسی کی عبارتیں اور شعر بھی آئے ہیں اور ایک نقل میں عربی کے دو مقولے ہیں جن کا ترجمہ اُردو میں کر دیا گیا ہے۔ ہندی کی کہاوتوں کے لیے نقلیات نمبر ۴، ۱۶، ۴۸، ۵۱، ۵۸، ۸۹ اور ۹۸، فارسی کے ضرب الامثال کے لیے نقلیات نمبر ۱۵، ۲۲، ۳۱، ۴۹ اور ۵۴، پنجابی کی کہاوتوں کے لیے نقل نمبر ۹۱ اور ۹۲ اور عربی کے مقولوں کے لیے نقل نمبر ۸۱ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ چند باتیں ہیں جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نقلیات کی ترتیب میں قدم قدم پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ ہر نقل مبتدی غیر ملکیوں کو بعض نئے لفظوں اور محاوروں اور نئی کہاوتوں سے روشناس کرانے کے علاوہ انھیں ان کے استعمال پر قادر بنائے، اور وہ باتوں باتوں میں یا دلچسپ حکایتیں پڑھتے پڑھتے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اس معاشرتی اور تہذیبی ماحول اور فضا سے قریب ہوتے اور اس کا ایک حصہ بنتے اور کبھی کبھی اس میں گم ہوتے محسوس کر سکیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ انھیں ان نقلوں

حکایتوں، چٹکلوں اور لطیفوں میں ان لوگوں کے ذہن اور قلب کا عکس نظر آسکے، جن کی زندگی اُن کا منبع اور ان کا گہوارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نقلوں کی زبان کو عموماً اس ٹکسالی روزمرّہ اور اس روزمرہ کے محاورے سے قریب رکھا گیا ہے، جس کا سب سے دل کش نمونہ میر امن کی 'باغ و بہار' میں ملتا ہے، اور جس کا لطف کہیں کہیں حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس اور حفیظ الدین کی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔ لیکن نقلیات کی زبان و بیان میں جا بجا وہ حشو و زوائد بھی موجود ہیں جو اُنیسویں صدی کے شروع کی نثر اردو یعنی گویا فورٹ ولیم کالج کے سب مصنفین یا اس عہد کے دوسرے مصنفین (مثلاً محمد بخش مہجور، انشاء اللہ خاں) کی تحریروں میں عام ہیں۔ جملوں میں مبتدا، خبر، صفت، موصوف، مضاف، مضاف الیہ کی ترتیب، بعض موقعوں پر حرف جار کا ترک، بعض جملوں میں علامت مفعول کے طور پر 'سے' کے بجائے 'کو' کا استعمال، محاوروں کا فارسی اصل کے مطابق ترجمہ، جو سو اور جب تب کا لازم و ملزوم کی طرح اور تب کی جگہ تد، کسی کی جگہ کسو، کہ کی جگہ جو، وہ کی جگہ 'وے'، پہلے کی جگہ آگے، آئے، جائے، ہو کے بجائے آوے، جاوے، ہووے کا استعمال اس زبان کی بعض عام خصوصیتیں ہیں اور فورٹ ولیم کالج کے ہر مصنف کی تحریریں ملتی ہیں۔ یہ سب چیزیں 'نقلیات' کی نقلوں میں بھی ہیں، لیکن دوسری تحریروں اور نقلیات کی عبارتوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ان میں اُن متروکات سے کہیں زیادہ جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا، لفظوں کے استعمال کی ایسی صورتیں ملتی ہیں جو آجکل کے استعمال سے مطابقت رکھتی ہیں۔ مثلاً کو پوچھا، اور 'کو کہا' کے ساتھ بہت سی جگہوں پر 'سے پوچھا' اور 'سے کہا' بھی ہے۔ جہاں چند جملوں میں 'جو' کو 'کہ' کی طرح استعمال کیا گیا ہے (مثلاً نقل نمبر ۲، ۱۴، ۱۴ اور ۱۰۷ میں) اکثر موقعوں پر 'کہ' استعمال ہوا ہے۔ (آدھی سے زیادہ نقلوں میں ایسا ہے)۔ بعض جملوں میں 'آکر'، 'جاکر'، 'کھاکر' کی جگہ صرف آ، جا، اور کھا لکھا گیا ہے، لیکن اس سے زیادہ جملے ایسے ہیں جن میں فعل اپنی مکمل صورت میں آیا ہے (جیسے نقل نمبر ۵، ۱۰، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۵، ۴۱، ۴۹، ۵۵، ۶۲، ۶۵، ۷۳، ۸۴، ۹۳، ۹۵ اور ۱۰۰ میں) بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک

ہی نقل میں استعمال کی یہ دونوں صورتیں موجود ملتی ہیں۔

ایک اور بات بھی قابل بحث ہے۔ مقدمے کے کسی حصے میں میں نے گلکرسٹ کے اس بیان کا حوالہ دیا ہے کہ ان نقلوں کی تصنیف یا تالیف میں میر بہادر علی حسینی نے دوسرے منشیوں سے بھی مدد لی ہے۔ میں نے فورٹ ولیم کالج کی چھپی ہوئی اُن سب کتابوں کو، جن میں کسی نہ کسی طرح نقلیں اور حکایتیں وغیرہ بیان کی گئی ہیں، اس نظر سے دیکھا کہ شاید ان میں سے کسی میں کوئی نقل ایسی مل جائے جو 'نقلیات' میں شامل ہو، لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔ البتہ ایک چیز ایسی سامنے آئی جس سے گلکرسٹ کے بیان کی تائید ہوئی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کو اپنے لندن کے قیام میں حیدر بخش حیدری کی بہت سی مختصر حکایتیں ملی ہیں۔ ان میں سے چند انھوں نے 'افکار' کراچی کے افسانہ نمبر میں چھپنے کے لیے بھیجی ہیں۔ اُن حکایتوں میں سے دو ایسی ہیں جو نقلیات میں بھی شامل ہیں (نقل نمبر ۱۵ اور ۳۳ نقلیات)۔ حیدری کی لکھی ہوئی دو اور حکایتیں تھوڑے سے فرق کے ساتھ مجموعۂ نقلیات میں شامل ہیں (نمبر ۹ اور ۳۷ نقلیات) حیدری کی باقی حکایتیں سامنے آئیں گی تو یقین ہے کہ اُن میں بھی کچھ ایسی ہوں گی جو حسینی والے مجموعۂ نقلیات میں شامل کی گئی تھیں۔[1]

---

[1] تحریر: وقار عظیم، ۲ جنوری ۱۹۶۶ء

۳

اختتامیہ نقلیات از: گلکرسٹ، ترجمہ از: پروفیسر سیّد وقار عظیم

زیرِ ترتیب نقلوں میں، مَیں نے اِملا کی جو اصلاح شدہ صورت اختیار کی ہے، مجھے برابر اس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کا احساس رہا ہے لیکن چونکہ املا کی اس صورت میں اچھے پہلو بُرے پہلوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں، اس لیے میں اپنی اس کوشش سے (جو اس موضوع پر آخری کوشش ہے) غیر مطمئن ہرگز نہیں ہوں۔ لیکن ایک لفظ جس سے سابقہ پڑا اور جو کسی طرح گرفت میں نہیں آتا، چاندی کے اس سکے کا نام ہے، جسے ہم Rupee کہتے ہیں۔ یہ لفظ واحد اور جمع کے علاوہ فاعلی اور مختلف مفعولی صورتوں میں طرح طرح بولا اور لکھا جاتا ہے۔ مثلاً روپَیا، روپیہ، روپیا، روپَیَّہ، روپیٔے، روپَے، روپُیوں، روپیوں، روپیّوں۔ اس کے علاوہ اس لفظ میں جہاں کہیں oo کی آواز نکلتی ہے، وہاں o بول دیا جاتا ہے۔ oo کی آواز خواہ زیادہ صحیح نہ ہو لیکن زیادہ پُرانی ضرور ہے، اس لیے کہ اس لفظ کی اصل روپا ہے، جس کے معنی ہیں چاندی۔ تقریباً یہی صورت انگریزی کے لفظ Silvering کی ہے۔ اسی طرح یہ، یَہ، وہ اور وَہ کے مشتقات گوناگوں صورتیں اختیار کرتے ہیں۔ یہاں، یَہاں، اِیہاں، اِہاں، یَہاں، ہِیاں، وَہاں، وُہاں، وَہاں، ہُواں، اَیسا، وَیسا، اُس، وِس، وغیرہ۔ اُس اور

وِس کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان حروف کی اصل صورت یہ اور وہ تھی، اور ان کی مفعولی صورت یِس اور وِس تھی۔ لیکن اس بحث کو میں طول نہیں دینا چاہتا، کہ کہیں اس طرح کی قیاس آرائی ہمیں گمراہ کر کے لسانیات کے وسیع خارزار میں نہ اُلجھا دے۔

طالب علموں کو اس وقت تک اندازہ ہو چکا ہوگا کہ جن حروف کی آواز اصل میں مرکب ہے اور جنہیں میں اب تک مفرد صورت میں لکھتا رہا تھا، اب ان کی اصل آوازیں واضح ہو گئی ہوں گی۔ سنسکرت میں قاعدہ ہے کہ دو مرکب ایک ساتھ آئیں تو پہلے حرف کی آواز کو گرا دیا جاتا ہے۔ میں نے uch-chha، muk-khee، hut-tha (اچّھا، مکّھی، ہٹّھا) جیسے لفظوں کو uchhchha، mukhkhee اور Thuththa (اچھچھا، مکھکھی، اور ہٹھٹھا) نہیں لکھا۔ اس طرح کی مثالوں میں میں نے Hyphen صرف اس غرض سے استعمال کیا ہے کہ پڑھنے والوں کو اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ دونوں حروف میں سے پہلے پر زور دینا ضروری ہے۔ میں نے املا کا جو طریقہ اس سے پہلے استعمال کیا تھا، اس میں لفظوں کی صحیح صورت واضح نہیں ہوتی تھی اور اس لیے پڑھنے والے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ نقلوں میں بہت سے لفظ ایسے ملیں گے، جن پر اسی اصول کا اطلاق ہوتا ہے، جس کا اوپر والی مثالوں میں۔ اس کے علاوہ بہت سے لفظ اور بھی ملیں گے۔ ان تمام لفظوں کے املا میں یہ عام قاعدہ کام کرتا ہے کہ جب طویل حروفِ علت کھینچ کر نہ پڑھے جائیں تو ان کے بعد آنے والے حرفِ صحیح کی آواز مشدد ہو جائے گی، جیسے باتی سے بتّی، چادر سے چدّر، چاکو سے چکّو، ماٹی سے مٹّی یا مَٹّی؛

بول چال میں مصادر کے پہلے حرف پر a کی آواز u کی آواز بن جاتی ہے جیسے rakhna، Pakna اور Chakhna بول چال میں Pukna، Chukhna، Rukhna ہو جاتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمان اپنے تلفظ میں اس تشدید کو پوری طرح ادا کرتے ہیں جو رکّھا، پکّا اور چکّھا میں موجود ہے۔ اس کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں نکلتا کہ جن مصادر کا ابھی

ذکر کیا گیا، ان کی اصل صورت 'Pukkna اور Rukhkhna تھی۔ لیکن چونکہ مقامی باشندے اس معاملے میں اتفاق رائے نہیں رکھتے اس لیے اس بحث کو میں آئندہ تحقیق پر ملتوی کرتا ہوں۔

کچھ عرصے سے ہم نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ عربی کے بعض الفاظ کے آخری حرف پر جو تشدید ہے، اسے املا میں بھی ظاہر کیا جائے۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح عربی کے قاعدے سے مطابقت قائم رہتی ہے، اور دوسری یہ کہ اس طرح اصل الفاظ اور ان کے مشتقات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً دقّ، ردّ، حسّ اور حدّ سے مدقوق، مردود، محسوس، محدود وغیرہ۔

یہ الفاظ (دق، رد، حس اور حد وغیرہ) پہلے تشدید کے بغیر لکھے جاتے تھے، اس لیے مبتدیوں کے لیے اسم مفعول کی صورت (مدقوق، مردود، محسوس، محدود) سخت الجھن کا موجب ہوتی تھی۔ آئندہ یہ صورت پیش نہیں آئے گی۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو کبھی کبھی میرے اس Hindee Arabic Table کا مطالعہ محنت اور توجہ کے ساتھ کرتے رہیں جو حال میں شائع ہوا ہے۔ تحریر میں کہیں آخری حرف پر تشدید لگی ہوئی نہ ملے تو اسے محض سہو سمجھنا چاہیے۔ جو قاری یہ محسوس کریں کہ میرے اختیار کیے ہوئے املا کے طریقے میں کہیں کہیں ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ پچھلے صفحات کو غور سے پڑھیں انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ جن موضوعات میں سرے سے قواعد کا وجود ہی نہ ہو ان میں قواعد کی یکسانی پیدا کرنا کس قدر ممکن ہے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ 'Shirmundu Shurmundu 'Shurmindu اور Shirmindu میں سے کون سا زیادہ صحیح ہے، میرے دائرۂ عمل میں شامل نہیں۔ البتہ یہ بات میرے فرائض میں داخل ہے کہ املا میں ان چاروں صورتوں کو ظاہر کروں تاکہ جو قواعد میں نے اب تک بیان کیے ہیں ان کی صداقت بھی واضح ہو جائے اور پڑھنے والوں کو ایک ہی لفظ کے ان سب تلفظوں کا علم بھی ہو جائے، جن سے انھیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سابقہ پڑے گا۔ جب کسی زبان میں حروف آپس میں اس طرح متبادل ہوں جیسے ہندوستانی اور دوسری مشرقی زبانوں میں، تو یہ بحث کبھی

ختم نہ ہونے والی بحث بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر Khenchna Khuenchna اور Kheenchna میں یا 'Khoorshed Khoorshued اور Khoorsheed میں۔ بعض اوقات میرے ساتھ بھی یہ صورت پیش آئی ہے کہ بعض لفظوں کی نئی اور عجیب و غریب صورت دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن جب منشی صاحبان نے کسی مستند لغت کا حوالہ دے دیا تو میں مطمئن ہو گیا۔ مجھے توقع ہے کہ ذہین قاری کا طرزِ عمل بھی یہی ہوگا۔

اگر نقلوں[1] کے اس مجموعے کو قارئین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو مرتب ایسے ہی مزید مجموعے مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ مشرق میں کہاوتوں اور محاوروں کے مفہوم اور مذہب، اخلاق، علوم، فنون، قوانین اور رسم و رواج میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ ہندوستانی زبان کے ہر طالب علم کو اپنی، روزمرہ زندگی میں اس قوم کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں سے واقف ہونے کے موقعے ملیں گے، جس کے ساتھ اسے کئی برس تک زندگی بسر کرنی ہے، اور اس طرح اس زبان کے محاورے اور روزمرہ سے شناسائی حاصل ہوگی، جو اس ملک کے اکثر رہنے والوں کی زبان ہے۔ صرف اسی نقطۂ نظر سے میں نقلوں کا یہ مجموعہ مرتب کر کے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ میں آئندہ بھی ایسے مجموعے مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اس لیے اگر مختلف حضرات مجھے ہندوستانی میں لکھی ہوئی طبع زاد یا ترجمہ شدہ دلچسپ حکایتیں، نقلیں اور کہانیاں ارسال فرماتے رہے، بشرطیکہ وہ اخلاق اور شائستگی کے خلاف نہ ہوں، تو میں انھیں شکریے کے ساتھ ان مجموعوں میں شامل کروں گا۔ اس مجموعے میں میں نے نقلوں کا انگریزی ترجمہ شامل نہیں کیا۔ (آئندہ اشاعتوں میں بھی یہی کیا جائے گا) اس لیے کہ اس طرح اس ذہنی سستی اور سہل انگاری کو تقویت پہنچی جس کا شکار میرے ہم وطن ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد ہو جاتے ہیں، اور جس میں ہندوستان کی گرم آب و ہوا اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی مثال اور زیادہ اضافہ کرتی ہے۔ جہاں تک ہندوستانی زبان کا تعلق ہے میرے دعوے کے صحیح ہونے کا

---

[1] گلکرسٹ نے اس جگہ Stories کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اپنے سرکاری منصب کے لحاظ سے
اس عام زبان میں، ماہر ہونا چاہیے تھا وہ سب اِلّا ماشاء اللہ اس سے قطعاً ناواقف
ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہے کہ ان افسروں کے ہندوستانی معلم اس
جہالت کو مستقل بنانے میں مصروف ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے جو براہِ راست تجربے ہوئے
ہیں ان کی بناء پر میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ایک منشی ایسا ہے جو قواعد کے اصول
کے مطابق ہندوستانی زبان سکھانے کا اہل اور خواہش مند ہے تو ننانوے منشی ایسے ہیں جو ہمیں فارسی
اور عربی پڑھانا چاہتے ہیں۔ جس زبان کو ہندوستان کی عام زبان کہنا چاہیے[1] اس کے پھیلانے
کے سلسلے میں بہت سی رکاوٹیں ایسی ہیں جو برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور
کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے اور مجھے توقع ہے کہ
میری یہ کوشش بارآور ثابت ہوگی۔ میں پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں
کہ برطانوی ہندوستانی سلطنت (British Indian Empire) کی عام فلاح اور
ترقی کا اس بات سے بڑا قریبی تعلق ہے کہ ہم ہندوستان کی کارآمد زبانوں میں کس حد
تک مہارت پیدا کرتے ہیں۔ زبانوں کا وسیلہ ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کی مدد سے
ہم ان فریب آمیز غلطیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں جو مقامی کردار سے ناواقفیت کی
بناء پر ہم سے سرزد ہوتی ہیں۔ ہندوستان جیسے ملک میں مقامی سورماؤں (اس میں مرد
اور عورت دونوں شامل ہیں) کے لیے یہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں احترام اور
تقدس کے جو جذبات ہیں، بدقسمتی سے ان کا تصادم اگر عدل، احترام، شائستگی
اور توجہ کے ان اوصاف سے ہو جائے جو محکوم قوم کے قومی حقوق، روح اور کردار
کے لیے ہونا چاہیے تو اس کا جو مہلک نتیجہ نکلے گا، اس کا اندازہ لگانا دشوار
نہیں۔ خیر کی انتہا حقیقی شر بن جاتی ہے اور ہندوستان جیسے علاقوں کے
متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ تشدد بڑا شر ہے یا درگزر۔ تاہم اس بات سے انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ دوسرے نازک مرحلوں کی طرح اس مرحلے پر بھی اعتدال کا راستہ

[1] گلکرسٹ نے اسے Popular Speech of Hindoostan کہا ہے۔

سب سے اچھا راستہ ہے۔

پہلی جلد کے خاتمے پر مرتب ان سب حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے، جن
کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ جو نقلیں (Tales) دیر میں موصول ہوئیں اُنھیں دوسری
جلد میں شامل کر لیا جائے گا، جو غالباً فروری ۱۸۰۳ء میں شائع ہوگی۔

اضافاتِ مزید:

اگلے صفحات میں فورٹ ولیم کالج کے بارے میں دو اہم مضامین شامل کیے جا رہے ہیں جو بیک وقت ہم عصر مآخذ اور جدید ترین مصادر سے استفادہ کرنے کے بعد لکھے گئے ہیں، اس لیے بہت سی نئی اور بنیادی قیمتی معلومات کے حامل اور موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق تلاش و تحقیق کا دلآویز نمونہ ہیں پہلا مضمون سید سبطِ حسن مرحوم کا ہے اور دوسرا محترم ضمیر نیازی کا زائیدۂ قلم ہے۔

[مرتب]

(۱)

فورٹ ولیم کالج

سید سبطِ حسن

فورٹ ولیم کالج سرزمینِ پاک و ہند میں مغربی طرز کا پہلا تعلیمی ادارہ تھا جو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل (۱۷۹۸ - ۱۸۰۵ء) کے حکم سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں قائم ہوا۔ کالج قائم کرنے کا فیصلہ گورنر جنرل با اجلاس نے ۱۰-جولائی ۱۸۰۰ء/ ۱۷-صفر 1215ھ کو کیا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ کالج کا یوم تاسیس ۴-مئی ۱۸۰۰ء تصور کیا جائے کیونکہ وہ دن سلطان ٹیپو کے دار الحکومت سرنگا پٹم کے سقوط کی پہلی سالگرہ کا دن تھا[1] مگر فورٹ ولیم کالج میں باقاعدہ تعلیم ۲۴-نومبر ۱۸۰۰ء سے شروع ہوئی[2]۔

فورٹ ولیم کالج عام طالب علموں کے لیے نہیں کھولا گیا تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کو بالخصوص اُن ناتجربہ کار سول ملازمین کو جو سولہ سترہ سال کی عمر میں ہندوستان آتے تھے باقاعدہ تعلیم دے کر کمپنی کے مقبوضات

---

[1] لارڈ ویلزلی کے مراسلات، خطوط اور یادداشت (بزبان انگریزی)، مرتبہ: مانٹگمری مارٹن، جلد دوم صفحہ ۲۵۶، مطبوعہ لندن ۱۸۳۶ء

[2] کلکتہ گزٹ کے منتخبات (بزبان انگریزی)، جلد سوم، صفحہ ۱۷، مرتبہ: ڈبلیو۔ ایس سیٹن کار، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء

کا نظم و نسق سنبھالنے کے لائق بنایا جائے۔ کالج کا نصاب بہت جامع اور وسیع تھا۔ ہندوستان کی تاریخ جغرافیہ، مسلم فقہ اور ہندو دھرم، اس ملک کے باشندوں کے رسوم و رواج، کمپنی کے آئین و ضوابط، گورنر جنرل کے وضع کردہ قوانین، برطانوی آئین اور طرزِ حکومت، برطانیہ کا قانونِ انصاف یہ سب علوم نصاب میں داخل تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستانی، فارسی، عربی، بنگالی، سنسکرت اور دیگر مشرقی زبانوں کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ طلبہ کے اخلاق و عادات کی تربیت اور اصلاح بھی کالج کے فرائض میں داخل تھی[3]

ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ تھی اس لیے کمپنی کے ملازمین کو ہر وقت اس ملک کے باشندوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ان کی زبان اور طور طریقوں سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھنی پڑتی تھی[4]۔ جنگِ پلاسی کے بعد جب ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار، بنارس اور اڑیسہ کے علاقے کمپنی کے زیرِ اقتدار آئے تو کمپنی کے ملازمین کے لیے رعایا کی زبان، مذہبی عقائد اور معاشرتی حالات سے آگاہی اور زیادہ ضروری ہوگئی۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء-۱۷۸۵ء) کے زمانے ہی میں ہیڈلے، ڈاکٹر بالفور، مسٹر ولکنس اور ڈاکٹر گلکرسٹ نے کمپنی کے انگریز ملازمین کی سہولت کے لیے لغت، گرامر اور زبان دانی کی کئی کتابیں مرتب کیں۔ کمپنی اپنے سول اور فوجی ملازمین کو ایک معینہ مدت کے لیے تیس روپے ماہانہ 'منشی الاؤنس' بھی دینے لگی تاکہ یہ لوگ منشیوں اور پنڈتوں سے ہندوستانی، فارسی اور دوسری زبانیں سیکھ لیں[5]۔ مگر دشواری یہ تھی کہ ہندوستانی منشی اور پنڈت انگریزی زبان سے شاذ و نادر ہی واقف ہوتے تھے۔ اس لیے نو وارد انگریزوں کو پہلے بول چال کی زبان سیکھنی ہوتی تھی تاکہ منشی سے بات چیت کر سکیں اور اس کی زبان سمجھ سکیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ نو وارد انگریز ملازمین منشیوں

---

[3] لارڈ ولیزلی کے مراسلات، صفحہ ۳۳۰

[4] گلکرسٹ اور اس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ ۱۹۶۰ء، صفحہ ۴۸

[5] ایضاً۔ صفحہ ۵۱

کی خدمات سے بہت کم مستفید ہوتے تھے[6]

لارڈ ولیزلی مئی ۱۷۹۸ء میں گورنر جنرل ہو کر کلکتہ آیا۔ وہ لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر دفتر میں ایک بڑے عہدے پر فائز رہ چکا تھا اس لیے ہندوستان کے حالات اور کمپنی کے مسائل سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے کلکتہ پہنچتے ہی محسوس کر لیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اب فقط ایک تجارتی ادارہ نہیں رہی بلکہ ہزاروں مربع میل زمین اور لاکھوں باشندوں کی تقدیر اس کے قبضے میں ہے لہٰذا کمپنی کے مفاد اور مقبوضات کے نظم و نسق کا تقاضا یہی ہے کہ انگریز ملازمین کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ۲۱، دسمبر ۱۷۹۸ء کی ایک یادداشت میں وہ لکھتا ہے کہ "سول ملازمین کی تعلیم کے موجودہ نقائص مدت سے میری توجہ کا مرکز ہیں اور میں نے ان نقائص کو دور کرنے کی غرض سے ایک وسیع منصوبے کا بنیادی خاکہ تیار کر لیا تھا اور کونسل کے روبرو اس کا زبانی بھی ذکر کیا تھا" مگر میسور کی جنگ کے باعث اس منصوبے پر فوری عمل نہیں ہو سکا[7]۔

اس وقت خوش قسمتی سے کلکتے میں کمپنی کے کئی اعلیٰ عہدہ دار اور پادری ایسے موجود تھے جن کو لارڈ ولیزلی کے خیالات سے پورا پورا اتفاق تھا اور جو مشرقی زبانوں اور علوم مغربی پر پورا عبور رکھتے تھے۔ ان میں سب سے پیش پیش ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو ہندوستانی (اردو) زبان سے والہانہ محبت تھی۔ اس نے گورنر جنرل کو ایک یادداشت بھیجی جس میں لکھا تھا کہ وہ نو وارد رائٹروں (انگریز ملازمین) کو روزانہ ہندوستانی زبان کا درس دینے کے لیے تیار ہے۔ لارڈ ولیزلی نے گلکرسٹ کی یہ تجویز منظور کر لی۔ چنانچہ ۲۱۔ دسمبر ۱۷۹۸ء کو گورنر جنرل با اجلاس نے یہ حکم صادر کیا کہ کمپنی کے کسی سول ملازم کو ذمہ داری اور اعتماد کے مخصوص عہدوں پر اس وقت تک متعین نہ کیا جائے جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس نے گورنر جنرل با اجلاس کے نافذ کردہ تمام قوانین و ضوابط سے نیز مختلف مقامی زبانوں سے پوری

---

[6] پروسیڈنگز آف دی جنرل کاؤنسل، مورخہ ۲۱۔ ستمبر ۱۷۹۸ء بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد صفحہ ۱۰۹

[7] لارڈ ولیزلی کے مراسلات، صفحہ ۶۴۹

واقفیت حاصل کرلی ہے۔ نیز یہ کہ پہلی جنوری ۱۸۰۱ء سے کوئی سول ملازم بنگال، بہار، اُڑیسہ اور بنارس میں اہم عہدوں کا اُس وقت تک مستحق نہیں سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ قوانین وضوابط اور مقامی زبانوں کا امتحان پاس نہ کرلے۔ زبانوں کا جاننا ان عہدوں کے لیے بالکل لازمی تھا۔[8]

اس فیصلے کے مطابق لارڈ ویلزلی نے ڈاکٹر گلکرسٹ کو سول ملازمین کو فارسی اور اُردو پڑھانے پر مامور کیا کہ یہ دونوں زبانیں کاروبارِ مملکت کے لیے سب سے ضروری تھیں۔[9] اس طرح ڈاکٹر گلکرسٹ کی "اورینٹل سیمینری" وجود میں آئی۔ جنوری ۱۷۹۹ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ کو ان سول ملازمین کی فہرست مل گئی جو فارسی اور ہندوستانی سیکھنے کے آرزومند تھے اور فروری ۱۷۹۹ء میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے رائٹرس بلڈنگ میں درس دینا شروع کردیا۔[10]

ڈاکٹر گلکرسٹ تقریباً ڈیڑھ سال تک سول ملازمین کو ہندوستانی اور فارسی پڑھاتے رہے۔ تب لارڈ ویلزلی کے حکم سے پانچ اعلیٰ افسروں کی ایک کمیٹی نے ۲۱ تا ۲۵ جولائی ۱۸۰۰ء میں طلبا کا امتحان لیا اور مفصل رپورٹ گورنر جنرل کے روبرو پیش کی۔ گورنر جنرل نے کامیاب طلبہ میں سے بارہ کو نقد رقم اور تمغے انعام دیے اور ان کی زباں دانی کو سراہا۔[11]

لیکن یہ عارضی انتظام تھا اور اس سے لارڈ ویلزلی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ جس وسیع تعلیمی منصوبے کا خاکہ اس نے تیار کیا تھا اس کا چھوٹے پیمانے پر تجربہ ہو جائے۔ دراصل ڈاکٹر گلکرسٹ کی "اورینٹل سیمینری" فورٹ ولیم کالج کی پہلی کڑی تھی۔ اس سے نظم ونسق کی کل ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کو سول ملازمین پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ جب چاہتے لکچر میں شریک ہوتے جب چاہتے شریک نہ ہوتے۔ ڈاکٹر

[8] کلکتہ گزٹ کے منتخبات (بزبان انگریزی) جلد سوم، صفحہ ۲۲-۲۳

[9] ایضاً، صفحہ ۶۲

[10] ایضاً، صفحہ ۶۹

[11] ایضاً، صفحہ ۵۸-۶۵

گلکرسٹ ان کے اخلاق وعادات کی نگرانی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ سول ملازمین کو حصولِ درس کے علاوہ اپنے سرکاری فرائض بھی انجام دینا ہوتے تھے اس لیے یکسوئی سے پڑھائی نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر یہ بھی ہوتا کہ نوجوان ملازمین زبان سیکھنے کے بہانے مفصلات سے کلکتے آجاتے اور اگر کلکتے میں ہوتے تو سبق کا عذر کرکے دفتر سے غائب ہو جاتے اور پھر خوب گل چھرّے اڑاتے۔[12] ظاہر ہے کہ تعلیم کے اس انتظام سے کمپنی کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچنے کا اندیشہ بہت قوی تھا۔

یہ تھے وہ اسباب ومحرکات جن کے تحت لارڈ ویلزلی نے کالج کے منصوبے کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اُس نے کمپنی کی مجلسِ نظما کی منظوری بھی حاصل نہیں کی اور ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کے قیام کا اعلان کردیا۔ بورڈ سے کالج کے ریگولیشن پر مہرِ توثیق لگوالی اور انتظامات شروع کردیے۔ البتہ ایک دن پیشتر جو رپورٹ اُس نے نظم ونسق سے متعلق مجلسِ نظما کو لندن بھیجی اُس میں اطلاعاً لکھ دیا کہ گورنر جنرل بااجلاس نے کلکتے میں سول ملازمین کے لیے ایک تعلیمی ادارہ کھولنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور یہ کہ اس منصوبے کی تفصیلات بعد میں روانہ کردی جائیں گی۔[13]

یہ تفصیلات ایک طویل یادداشت کی صورت میں ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء کو مجلسِ نظما کو بھیجی گئیں۔ اس یادداشت میں لارڈ ویلزلی نے کالج کی اہمیت اور افادیت پر مفصل روشنی ڈالی تھی اور کالج کے قوانین وضوابط کی تشریح کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان آنے والے ہر نئے ملازم کو ہدایت کی جائے کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں بھرتی ہو کر پہلے اپنی تعلیم مکمل کرے اُس کے بعد گورنر جنرل بااجلاس کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہو کہ طالب علم کس صوبے اور کس عہدے کے لیے زیادہ موزوں ہوگا۔ لارڈ ویلزلی نے کالج کے مصارف کے لیے بنگال اور میسور کی مالگزاری پر کالج ٹیکس لگانے کی اجازت بھی طلب کی تھی۔[14]

[12] لارڈ ویلزلی کے مراسلات، ص ۳۳۱

[13] ایضاً، ص ۳۲۳-۳۲۴

[14] ایضاً، ص ۳۵۴-۳۵۵

فورٹ ولیم کالج کا ریگولیشن ۲۷ دفعات پر مشتمل تھا۔[15] اس ریگولیشن کے تحت گورنر جنرل کالج کا سرپرست اور وزیٹر قرار پایا (دفعہ ۴) سپریم کونسل کے ارکان اور دیوانی عدالت کے صدر اور نظامت عدالت کے جج کالج تے گورنر مقرر ہوئے۔ (دفعہ ۵) کالج کا نظم و نسق پانچ ارکان کی ایک مجلس منتظمہ کے سپرد ہوا[16] پہلی مجلس منتظمہ کے ارکان یہ تھے پادری ڈیوڈ براؤن (پرووسٹ کالج)، پادری کلاڈیئس بکانن (نائب پرووسٹ)، آنریبل آرتھر ویلزلی (جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کے لقب سے مشہور ہوا)، سرجارج بارلو (جو بعد میں قائم مقام گورنر جنرل ہوا) اور مسٹر نیل بن جامن ایڈمانسٹن سیکرٹری حکومت[17]۔ کالج کا سب سے بڑا افسر پرووسٹ کہلاتا تھا۔ طے پایا کہ پرووسٹ ہمیشہ برطانوی کلیسا کا پادری ہوگا۔ (دفعہ ۱۱)۔

ریگولیشن کے تحت فورٹ ولیم کالج میں عربی، فارسی، ہندوستانی، سنسکرت، بنگالی، تیلوگو، مرہٹی، تامل اور کنڑی زبانوں کے شعبے کھولے گئے۔

اسلامی فقہ، ہندو دھرم، اخلاقیات، اصولِ قانون، برطانوی قانون، گورنر جنرل باجلاس کے وضع کردہ قوانین اور ریگولیشن، معاشیات، جغرافیہ، ریاضی، یورپ کی جدید زبانیں، یونانی، لاطینی اور انگریزی ادبیات، جدید اور قدیم تاریخ، ہندوستان اور دکن کی قدیم تاریخ، طبعیات، نباتات، کمسٹری اور علم نجوم کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا (دفعہ ۱۵)

سرجارج بارلو برطانوی ہند کے قوانین و ضوابط کے اعزازی پروفیسر ہوئے۔ اسی طرح مسٹر بن جامن ایڈمانسٹن فارسی کے اعزازی پروفیسر مقرر ہوئے۔ البتہ لفٹنٹ جان بیلی عربی پروفیسر کی تنخواہ سولہ سو روپے ماہانہ تھی اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ پروفیسر ہندوستانی کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہانہ تھی۔ اردو ادب کی بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے۔ یہ سراسر بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ فقط ہندوستانی کے پروفیسر تھے اور کبھی پرنسپل مقرر نہیں ہوئے۔ دراصل

---

۱۵ لارڈ ویلزلی کے مراسلات، ص ۳۵۶ - ۳۶۱

۱۶ ایضاً، ص ۳۴۷

۱۷ کالج کے ضوابط ضمیمہ لارڈ ویلزلی کے مراسلات، ص ۳۵۷

کالج میں پرنسپل کا عہدہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ فقط پرووسٹ ہوتا تھا جو طلبہ کے اخلاق و عادات کی نگرانی کرتا تھا اور کالج کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔[18]

ریگولیشن کے مطابق احاطۂ بنگال میں متعین ہونے والے تمام نو وارد سول ملازمین کے لیے کالج میں تین سال تک تعلیم پانا لازمی تھا (دفعہ ۱۸)۔ تعلیم کے زمانہ میں سول ملازمین اپنی ملازمت کے فرائض سے مستثنیٰ کر دیے جاتے تھے (دفعہ ۱۸)۔ احاطۂ بنگال کے ان ملازمین کے لیے بھی تین سال کی تعلیم لازمی تھی جن کو ابھی بنگال آئے تین سال نہیں گزرے تھے (دفعہ ۱۹)۔ ان کے علاوہ احاطۂ بمبئی اور مدراس کے سول اور فوجی ملازمین بھی گورنر جنرل کی اجازت سے کالج میں داخلہ لے سکتے تھے (دفعہ ۲۰-۲۱)۔ طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام مفت اور کالج کے ذمے تھا۔ (کالج کے ضوابط ص ۴۳۴)۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم کو تین سو روپے ماہانہ جیب خرچ بھی دیا جاتا تھا۔[19]

کالج میں دو دو ماہ کے چار ٹرم ہوتے تھے، پہلا ٹرم فروری اور مارچ کا، دوسرا مئی اور جون کا، تیسرا اگست اور ستمبر کا، چوتھا نومبر اور دسمبر کا۔ ہر ٹرم کے بعد ایک ماہ کی تعطیل ہوتی تھی۔ سال میں دو بار امتحانات ہوتے تھے۔ پہلا دوسرے ٹرم کے بعد اور دوسرا چوتھے ٹرم کے بعد (دفعہ ۲۳ و ضمیمہ ضوابط ۳)۔

لارڈ ویلزلی نے کالج کے لیے ایک وسیع عمارت میکڈانلڈ نامی ایک انگریز سے کرائے پر لی۔[20]

یہ عمارت شہر کے وسط میں تھی اور جب سب انتظامات مکمل ہو گئے تو ۲۴ نومبر ۱۸۰۰ء سے کالج میں باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔ پہلے دن فقط عربی کا درس دیا گیا دوسرے دن فارسی کا اور تیسرے دن یعنی ۲۶ نومبر کو ہندوستانی کی باری آئی۔[21] کالج میں ایک

---

۱۸ کالج کے ضوابط ضمیمہ لارڈ ویلزلی، ص ۴۳۲ - ۴۳۵

۱۹ لارڈ ویلزلی کے مراسلات، ص ۳۴۷

۲۰ ڈان آف نیو انڈیا (انگریزی)، بی۔این۔ بنرجی، کلکتہ ۱۹۲۷ء، صفحہ ۱۰۰ - ۱۰۱

۲۱ کلکتہ گزٹ کے منتخبات، صفحہ ۱۷

بڑا کمرہ کھانے کے لیے مخصوص تھا جہاں سب طلبہ کے لیے دونوں وقت کھانا لازمی تھا۔
پہلے ٹرم میں طلبہ کی کل تعداد ۴۶ تھی[22]۔

کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا تھا بالخصوص ہندوستانی اور فارسی پر کیونکہ ہندوستانی زبان شمالی ہند کی بول چال کی زبان تھی اور فارسی پورے ملک میں ہنوز دفتری اور درباری زبان تھی۔ لہٰذا السنۂ مشرق کے انگریز پروفیسروں کی مدد کے لیے ہر شعبے میں دیسی منشی اور پنڈت ملازم رکھے گئے۔ ان منشیوں کا کام درس و تدریس میں انگریز استادوں کا ہاتھ بٹانا اور طلبہ کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کرنا تھا۔
عربی، فارسی، ہندوستانی اور بنگالی کے شعبوں میں ایک ایک چیف منشی ہوتا تھا۔ اس کی تنخواہ دو سو روپے ماہانہ تھی۔ اس کے ماتحت ایک سیکنڈ منشی ہوتا تھا جس کی تنخواہ ایک سو روپیہ ماہانہ تھی۔ منشیوں کا انتخاب مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوتا تھا[23]۔

ان کے علاوہ سندی منشی بھی ہوتے تھے جن کو باقاعدہ امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔ یہ سندی منشی کالج کے ملازم نہیں ہوتے تھے البتہ ان کو طلبہ کو پرائیویٹ طور پر تعلیم دینے کی اجازت تھی۔ ان کی تنخواہ تیس روپے ماہانہ مقرر تھی جو طلبہ اپنی جیب سے دیتے تھے۔ کالج کے ملازم منشیوں کو پرائیویٹ ٹیوشن کی اجازت نہ تھی۔ چیف منشیوں کو اتوار کے علاوہ ہر روز (چھٹیوں میں بھی) دس بجے سے ایک بجے دن تک کالج میں حاضر رہنا ہوتا تھا کہ طلبہ ان سے استفادہ کر سکیں[24]۔

ہندوستانی، فارسی اور عربی کے منشی چونکہ کلکتہ میں کمیاب تھے اس لیے لکھنؤ اور دہلی کے ریذیڈنٹوں کو اپنے علاقے کے لائق منشی تلاش کر کے بھیجنے کی ہدایت کی گئی۔
ابتدا میں فارسی کے بیس ہندوستانی کے بارہ، بنگالی کے چھ اور عربی کے چار منشی مقرر ہوئے[25]۔

---

[22] ضمیمہ لارڈ ولیزلی کے مراسلات، ص ۷۳

[23] پروسیڈنگز آف دی کالج آف فورٹ ولیم، جلد اول، ص ۶۰-۶۱۔

[24] ایضاً، ص ۶۲-۶۳

[25] بنرجی، ص ۱۰۲

لیکن ہندوستانی زبان کی مقبولیت کے پیش نظر جلد ہی ہندوستانی منشیوں کی تعداد ۲۵ تک پہنچ گئی (گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۵۵)[26] ڈاکٹر گلکرسٹ کی تجویز پر ہندوستانی کے شعبے میں ایک قصہ خواں بھی مقرر ہوا جو طلبہ کو ان کی قیام گاہ پر جا کر داستانیں اور قصے سناتا تھا[29]۔
ہندوستانی زبان کے چیف منشی میر بہادر علی حسینی مصنف اخلاق ہندی و نقلیات لقمانی تھے۔ ان کا تقرر ۲۶ اپریل ۱۸۰۱ء کو ہوا۔ ان کے سیکنڈ منشی تارنی چرن متر تھے۔
عام منشیوں میں قابلِ ذکر میر امن دہلوی مصنف باغ و بہار، حیدر بخش حیدری مصنف آرائشِ محفل و توتا کہانی، کاظم علی جوان مصنف سنگھاسن بتیسی و بارہ ماسہ، میر شیر علی افسوس مصنف باغِ اردو، مظہر علی ولا مصنف بیتال پچیسی و مادھونل، للو لال کوی مصنف پریم ساگر اور خلیل علی خاں اشک مصنف داستانِ امیر حمزہ ہیں[27]۔
طلبہ کی ضروریات کے لیے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا۔ کتب خانے میں مغربی زبانوں کی مطبوعہ کتابوں کے علاوہ مشرقی زبانوں کے قلمی نسخوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ سلطان ٹیپو کا سارا کتب خانہ جو سرنگا پٹم سے کلکتے لایا گیا تھا کالج کے حوالے کر دیا گیا[28]۔
ابتدا میں طلبہ کو کتابیں گھر لے جانے کی اجازت تھی، مگر جب طلبہ کی لاپروائی سے نایاب مخطوطات گم ہونے لگے تو اگست ۱۸۰۷ء میں کتابیں لائبریری کے باہر لے جانے کی ممانعت ہو گئی۔ فورٹ ولیم کالج کی لائبریری اپنے زمانے میں برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی لائبریری تھی۔ اس میں ۱۸۳۵ء میں ۵۲۲۴ مطبوعہ مغربی کتابیں، ۱۱۷۱۸ مطبوعہ مشرقی کتابیں اور ۴۲۲۵ قلمی کتابیں تھیں[29]۔ ۱۸۳۶ء میں قلمی کتابیں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں منتقل کر دی گئیں۔
کالج میں تقسیم اسناد کا جشن (کانووکیشن) بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا۔ اس کے لیے

---

[26] گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۵۹

[27] بنرجی، ص ۱۱۱-۱۱۲ اور گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۹۰-۱۹۹

[28] لارڈ ویلزلی کے مراسلات، ص ۳۵۲-۳۵۳

[29] بنرجی، ص ۱۰۷

ضابطے کے مطابق ۶ - فروری کا دن مخصوص تھا۔ جلسے کی صدارت گورنر جنرل کرتا تھا۔ اس موقع پر کامیاب طلبہ کو سندیں دی جاتی تھیں - یہ سندیں اُسی مشرقی زبان میں سُنہرے حروف میں لکھی ہوتی تھیں جس میں طالب علم نے امتحان دیا ہوتا۔ تمغے اور نقد انعامات بھی دیے جاتے تھے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جلسۂ عام میں طلبہ کے درمیان مباحثے ہوتے تھے یہ مباحثے فارسی، ہندوستانی اور بنگالی زبانوں میں ہوتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک طالب علم مقررہ موضوع کی حمایت میں لکھی ہوئی تقریر کرتا اور دو طالب علم موضوع کی مخالفت میں لکھی ہوئی تقریریں کرتے - متعلقہ زبان کا پروفیسر ماڈریٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ تقریریں بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دی جاتی تھیں - ان تقریروں پر بھی طلبہ کو انعام دیا جاتا تھا[۳۰]۔ مباحثوں کے اختتام پر گورنر جنرل کامیاب طلبہ کو سندیں دیتا تھا اور جلسے سے خطاب کرتا تھا۔

ہندوستانی اور فارسی کے طلبہ میں اوّل، دوئم اور سوئم آنے والے طلبہ کو علی الترتیب پندرہ سو روپے، ایک ہزار روپے اور پانچ سو روپے اور طلائی تمغہ انعام ملتا تھا - البتہ بنگالی میں اوّل اور دوئم کو عربی میں فقط اوّل کو انعام دیا جاتا تھا - ان کے علاوہ فارسی نویسی اور ناگری نویسی کے ایک ایک ہزار روپے کے تین انعام تھے[۳۱]۔

اسی روز رات کے وقت گورنر جنرل کی طرف سے کالج میں ایک پُر تکلف دعوت ہوتی تھی جس میں گورنر جنرل اور کمپنی کے اعلیٰ عہدہ داروں کے علاوہ اساتذہ اور عمائدِ شہر بھی مدعو ہوتے تھے[۳۲]۔

فورٹ ولیم کالج فقط تعلیمی ادارہ نہ تھا بلکہ اپنے زمانے میں تصنیف و تالیف کا سب سے بڑا مرکز بھی تھا۔ اساتذہ اور منشی صاحبان درس دینے کے علاوہ طلبہ کے لیے کتابیں بھی لکھتے تھے - چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں لغتیں، تواریخ، اخلاقی، مذہبی اور قصوں کہانیوں

[۳۰] کالج کے ضوابط، دفعہ ۵، ۶، ۸

[۳۱] کلکتہ گزٹ، ص ۲۹۶، ۲۹۷

[۳۲] ایضاً، ص ۲۹۹

کی کتابیں بڑی تعداد میں تیار ہوئیں - یہ کتابیں زیادہ تر اساتذہ اور منشیوں کی تصنیف ہیں، لیکن دوسرے مصنفوں کی کتابیں بھی منظور کی جاتی تھیں مثلاً باسط خاں کی 'گل صنوبر'، شاکر علی کی 'الف لیلہ'، نہال چند لاہوری کا 'قصۂ گل بکاؤلی' اور مرزا علی لطف کی 'گلشن ہند' کالج کے زیر اہتمام چھپیں حالانکہ ان کتابوں کے مصنف کالج سے وابستہ نہ تھے[۳۳]۔ ان کے علاوہ کلیاتِ سودا اور مسکین کا مرثیہ بھی کالج میں چھپا۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں 'برہانِ قاطع' (فارسی کا لغت ۱۸۱۸ء)، 'انوار سہیلی' (۱۸۰۵) 'دبستان مذاہب' از شیخ محمد محسن (۱۸۰۹ء) 'ہدایہ' (۱۸۰۷ء)، عربی میں 'منتخب اللغات' (۱۸۱۸ء)، 'قاموس' (۱۸۱۷ء)، 'الف لیلہ' (۱۸۱۸ ۱۸۱۴ء)، 'مقامات حریری' (۱۸۱۲ء) اور 'تاریخ تیمور' (۱۸۱۸ء)، 'مشکوٰۃ' (انگریزی میں ۱۸۰۹ء)، 'پنجابی زبان کی گرامر' (۱۸۱۴ء) حتیٰ کہ چینی، ملائی اور برمی زبانوں کے لغت بھی شائع ہوئے[۳۴]۔

مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے منظور شدہ تصنیف پر انعام بھی دیا جاتا تھا۔ کالج کے باقاعدہ ملازمین کو کم اور باہر والوں کو زیادہ - مثلاً بوستان (۳۰۰ صفحے) کے اردو مترجم حاجی مرزا مغل کو چار سو روپے انعام دیا گیا[۳۵]۔ فورٹ ولیم کالج کی تخلیقی سرگرمیوں کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ابتدائی چار برس میں فقط ہندوستانی زبان کی ۹۳ کتابیں تصنیف ہوئیں[۳۶]۔ یہ کتابیں زیادہ تر اردو رسم الخط میں تھیں البتہ بعض کتابوں کے متن میں خفیف سی تبدیلی کر کے ناگری رسم الخط میں بھی چھاپا جاتا تھا - اُردو کی کتابیں ناگری کی مانند ٹائپ میں چھپتی تھیں۔ یہ ٹائپ نستعلیق کا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کا پہلا کانووکیشن ۶ - فروری ۱۸۰۲ء کو ہوا - اس تقریب کی صدارت سر جارج بارلو قائم مقام گورنر جنرل نے کی کیونکہ لارڈ ویلزلی اُن دنوں دورے

[۳۳] گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۲۰۰

[۳۴] بنرجی، ص ۱۱۳ - ۱۱۴

[۳۵] گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۷۷

[۳۶] ایضاً، ص ۳۸

پڑ گیا ہوا تھا۔ اس موقع پر فارسی مباحثے کا موضوع یہ تھا کہ "ہندوستان میں ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کا قیام برطانوی قوم اور دیسی لوگ (نیٹو) دونوں کے لیے مفید ہے"۔ ہندوستانی مباحثے کا موضوع تھا کہ "ہندوستانی زبان ہندوستان کی سب سے عام فہم اور مفید زبان ہے" اور بنگالی مباحثے کا موضوع یہ تھا کہ "ایشیا والوں میں تہذیب کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی یورپ والوں میں"۔[۳۷]

کالج کے مصارف کے لیے ابتدا میں لارڈ ویلزلی نے سول ملازمین سے عطیات حاصل کیے پھر چنگی اور محصول کا ایک ریگولیشن نافذ کیا۔ اس مد سے پہلے ہی سال بارہ لاکھ ستّر ہزار روپے وصول ہوئے۔ کالج کے سالانہ مصارف تقریباً چار لاکھ روپے تھے البتہ پہلے سال چھ لاکھ تیس ہزار خرچ ہوئے۔ پروفیسروں اور منشیوں کی تنخواہوں پر تقریباً ایک لاکھ روپے سالانہ خرچ آتا تھا۔[۳۸]

ابھی کالج کو کھلے ہوئے فقط ایک سال اور دو مہینے ہی گزرے تھے کہ کمپنی کی مجلس نظما نے ۲۷ جنوری ۱۸۰۲ء کو یہ فیصلہ کیا کہ کالج فوراً بند کر دیا جائے اور اس کی جگہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی "اورنیٹل سمینری" کو دوبارہ بحال کیا جائے[۳۹] مجلسِ نظما کی رائے میں باقاعدہ کالج کا قیام محض فضول خرچی ہے۔ مجلسِ نظما کا یہ حکم لارڈ ویلزلی کو ۱۰ جون ۱۸۰۲ء کو وصول ہوا۔

لارڈ ویلزلی کو مجلسِ نظما کے اس فیصلے پر بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کالج بند نہیں کیا بلکہ ۵۔ اگست ۱۸۰۲ء کو ایک طویل یادداشت لندن روانہ کی۔ اس یادداشت میں ویلزلی نے کمپنی کے اعتراضات کا مدلّل جواب دیا اور کالج کی اہمیت نہایت تفصیل سے بیان کی۔ مصارف کے بارے میں اُس نے لکھا کہ کالج پر کمپنی کی کوئی رقم صرف نہیں ہوتی۔ آخر میں اُس نے مجلسِ نظما سے درخواست کی تھی کہ کالج بند نہ کیا جائے۔[۴۰]

---

۳۷ بنرجی، ص ۱۱۴ - ۱۱۶

۳۸ لارڈ ویلزلی کے مراسلات، ص ۶۴۲

۳۹ ایضاً، ص ۶۴۰

۴۰ ایضاً، ص ۶۶۲

لارڈ ویلزلی نے اسی پہ اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے ایک بااثر دوست کے ذریعے کمپنی کے اربابِ اختیار کو اپنے اس ارادے سے بھی آگاہ کر دیا کہ "کورٹ نے اگر بالآخر کالج توڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو انگلستان لوٹتے ہی پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ قانون کے ذریعے کالج کی تجدید کی جائے"۔[۴۱]

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی مجلسِ نظما نے ۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کو یہ تجویز منظور کر لی کہ کالج تاحکمِ ثانی بدستور چلتا رہے۔[۴۲]

فورٹ ولیم کالج کا بانی اور روحِ رواں لارڈ ویلزلی تھا۔ جب تک وہ گورنر جنرل رہا کالج کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں ہونے پائی۔ کالج میں تصنیف و تالیف کا عہدِ عروج بھی یہی تھا۔ مگر لارڈ ویلزلی ۲۹۔ اگست ۱۸۰۵ء کو مستعفی ہو کر ولایت چلا گیا اور اس کے جانشینوں میں کوئی اتنا بااثر نہ تھا جو مجلسِ نظما کی مخالفتوں کا مقابلہ کر سکتا یا جسے کالج سے وہ دلچسپی ہوتی جو لارڈ ویلزلی کو تھی۔

لارڈ ویلزلی کے مستعفی ہونے کے کچھ دنوں بعد کمپنی کی مجلس نظما نے ۲۱ مئی ۱۸۰۶ء کو یہ فیصلہ کیا کہ ملازمین کی تعلیم کے لیے انگلستان ہی میں ایک کالج ہیلی بری کے مقام پر قائم کیا جائے۔[۴۳] اس کے ساتھ کلکتہ کو یہ ہدایت بھی بھیج دی گئی کہ جنوری ۱۸۰۷ء سے فورٹ ولیم کالج کے اخراجات کم کر دیے جائیں چنانچہ پرووسٹ اور نائب پرووسٹ کے عہدے توڑ دیے گئے۔ مشرقی زبانوں کی تعلیم کا نصاب گھٹا کر ایک سال کا کر دیا گیا۔ پنڈتوں اور منشیوں کی تعداد میں بھی تخفیف ہو گئی اور کالج کا عملہ مختصر کر دیا گیا۔[۴۴]

لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۵ء) کے عہد میں کالج کے مصارف اور کم کر دیے گئے

---

۴۱ رچرڈ مارکویز ویلزلی کی یادداشتیں اور مراسلات (بزبانِ انگریزی)
مرتبہ: پیرز، آر۔ آر، جلد دوم، صفحہ ۲۱۱ - ۲۱۲، مطبوعہ لندن، ۱۸۴۶ء

۴۲ بنرجی، ص ۱۲۴

۴۳ بنرجی، ص ۱۲۵

۴۴ بنرجی ص ۱۲۵

چنانچہ یکم جون ۱۸۳۰ء سے کالج میں فقط ایک انگریز سیکرٹری اور تین ممتحن رہ گئے۔ لیکچروں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ پروفیسروں اور منشیوں کے عہدے توڑ دیئے گئے اور کالج برائے نام رہ گیا۔ آخر جنوری ۱۸۵۴ء میں کالج کو بورڈ آف ایگزامنرز میں ضم کر دیا گیا اور فورٹ ولیم کالج کا وجود بالکل ختم ہو گیا[۵۴]

فورٹ ولیم کالج نے اپنی ۵۴ سالہ زندگی میں مشرقی علوم و السنہ بالخصوص اُردو زبان اور ادب کی بڑی خدمت کی۔ گو یہ تعلیمی ادارہ انگریزوں کے لیے قائم کیا گیا تھا اور کالج کے زیرِ اہتمام جو کتابیں لکھی جاتی تھیں وہ انگریزوں کے مذاق اور اُن کی ضرورت کی پیشِ نظر لکھی جاتی تھیں لیکن کالج کے قیام سے مغربی طرز کی درسگاہ کی جو روایت ہمارے ملک میں قائم ہوئی اس کے دوررس اثرات ایک تاریخی حقیقت ہیں۔ کالج کی ادبی اور علمی تصنیفات سے ہماری زبان اور ادب میں ایک نئے اور درخشاں باب کا آغاز ہوا۔ فورٹ ولیم کالج سے بیشتر اُردو نثر کی کوئی کتاب بول چال کی آسان زبان میں موجود نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ جدید اُردو نثر کی بنیاد فورٹ ولیم کالج میں پڑی چنانچہ کالج کی تصنیفات نے زبان اور بیان کا سانچا ہی بدل دیا۔ کالج کے منشیوں نے اردو نثر میں ایسی ابدی تخلیقات پیش کیں جن کا شمار ہمارے کلاسیکس میں ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے بیشتر اُردو نثر اور نظم کی کتابیں قلمی ہوتی تھیں اس لیے عام لوگ ان سے محروم رہتے تھے۔

فورٹ ولیم کالج کی بدولت اُردو کتب ہزاروں کی تعداد میں چھاپے خانوں میں چھپنے لگیں۔ اس طرح اُردو پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اُردو زبان و ادب زندہ ہیں فورٹ ولیم کالج کا نام بھی زندہ اور تابندہ رہے گا۔

---

۵۴ بنرجی، ص ۱۲۶

(۲)

فورٹ ولیم کالج

ضمیر نیازی

فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی تاسیس سے ۱۲۳ سال قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب بست و کشاد کی معاملہ فہم اور دوررس نگاہوں نے "ہندوستان" زبان کی اہمیت اور ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس ملک میں ان کے قدم اسی صورت میں جم سکتے ہیں جب وہ یہاں کی زبان میں مہارت حاصل کر لیں۔ ابھی اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں بند بھی نہیں ہوئی تھیں کہ کمپنی کی مجلسِ انتظامیہ نے ۲۲ ستمبر ۱۶۷۷ء کے اپنے ایک مراسلے میں قلعہ سینٹ جارج (مدراس) کو لکھا[۱]

"اس کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ کمپنی کے جو ملازمین فارسی سیکھیں گے اُن کو بیس پونڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔ نیز یہ کہ اس زبان کی تعلیم دینے والے کسی مناسب آدمی کا تقرر کیا جائے"[۲]

یہی انعام و اکرام پلاسی کی جنگ (۱۷۵۷ء) کے بعد ایک مستقل الاؤنس کی صورت اختیار کر گیا۔ کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کے قیام تک اپنے فوجی اور سول ملازمین کو ایک

---

۱ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۴۹، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ ۱۹۶۰ء
۲ ایضاً، ص ۱۵

معینہ مدت تک تیس روپے ماہوار کا وظیفہ منشی الاؤنس کے نام سے دینا شروع کیا تاکہ وہ منشی رکھ کر باضابطہ ہندوستانی اور فارسی کی تعلیم حاصل کر سکیں [1]

فورٹ[2] ولیم کالج کے قیام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے ،

" صاحبانِ ذی شان کو شوق ہوا کہ اُردو کی زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفت و شنید کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں[3] " باغ و بہار کی تالیف کے

---

[1] گلکرسٹ اور اُس کا عہد، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ ۱۹۶۰ء ص۱۵۱

[2] فورٹ ولیم : ۱۶۹۰ء میں اورنگ زیب کی فوجوں کے ہاتھوں شکست فاش کے بعد انگریزوں کو ایک صلح نامے کے ذریعہ کلکتہ میں ایک قطعہ آراضی مرحمت کیا گیا۔ دس سال بعد یعنی ۱۷۰۰ء میں انگریزوں نے اپنے تجارتی مفادات کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ نما بستی بنائی جسے فورٹ ولیم کا نام دیا گیا۔ اس کی دوبارہ تعمیر جنگِ پلاسی کے بعد ۱۷۵۷ء اور ۱۷۷۳ء کے درمیان عمل میں آئی۔ اس قلعہ کی سیاسی اہمیت اس بات سے عیاں ہے کہ کلکتہ آنے جانے والا کوئی بھی برطانوی جہاز اسے سلامی دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ ۱۷ مئی ۱۷۹۹ء کے کلکتہ گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں ٹیپو سلطان کی شہادت اور محاصرۂ سرنگاپٹم کی خبر کے ساتھ یہ اطلاع بھی درج ہے: "اس کامیابی کی خوشی میں گورنر جنرل نے فورٹ ولیم سے توپیں سر کیے جانے کا حکم جاری کیا تھا۔" ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران اور اس کے بعد بعض اہم سیاسی قیدی یہاں رکھے گئے تھے، جن میں واجد علی شاہ بھی شامل تھے جو چھبیس[26] ماہ تک اس قلعہ میں نظر بند رہے :

i) ہسٹری آف فریڈم موومنٹ، جلد اوّل، صفحہ ۶۴۰ ۔ از: آر۔ سی۔ موجمدار، کلکتہ ۱۹۶۲ء

ii) چیمبرس انسائیکلو پیڈیا، جلد دوم، صفحہ ۷۶۵

iii) گذشتہ لکھنؤ، صفحہ ۱۰۹، صفحہ ۱۲۰، عبدالحلیم شرر، بتصحیح و ترتیب: رشید حسن خاں، دہلی

iv) اردو ڈراما و اسٹیج، صفحہ ۲۱۱، سید مسعود حسن رضوی ادیب، طبع اوّل لکھنؤ ۱۹۵۷ء

[3] باغ و بہار، مقدمہ ص۳ مرتبہ : ممتاز حسین، کراچی ۱۹۵۸ء

بعد میر امن نے جب "گنج خوبی" لکھی تو اس کے ابتدائیہ میں واشگاف لفظوں میں یہ بھی لکھ دیا :

" صاحبانِ عالی شان، جو ارکانِ سلطنت کے ہیں ان کے حق میں معاملات ملکی کے سمجھنے بوجھنے کے لیے یہ غور فرمایا کہ جلد خبردار اور واقف کار ہو کر کارروائی عدالت اور تحصیل کی کریں لہٰذا ایک مدرسے (فورٹ ولیم کالج) کی ڈالی" [1]

اس مقصد کے علاوہ ایک مخصوص معیار بھی پیش نظر تھا :

" اس قصے (باغ و بہار) کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ، ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام۔ آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے" [2]

کالج کے ایک اور منشی میر بہادر علی حسینی نے "نثر بے نظیر" خاص و عام کی بول چال کے مطابق طرزِ سہل واسطے صاحبانِ نو آموز کے لکھی[3]۔

کپتان جان ولیم بہادر نے یہی ہدایت مولوی اکرام علی کو دی :

" رسالہ اخوان الصفا، کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے، تو اس کا زبانِ اردو میں ترجمہ کر، لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہوویں[4] تاکہ آسان و سلیس زبان کے رواج سے عربی اور فارسی کا اثر بتدریج کم ہو جائے اور یہی ہوا -

اس مخصوص معیار کو اپنانے کی وجہ وہ سیاسی مقاصد تھے جس کا اہلِ نظر کو بخوبی احساس تھا چاہے وہ کالج کے اندر ہوں یا باہر۔ اس درس گاہ کے خاتمے کو ابھی ربع صدی بھی نہیں بیتی تھی کہ محمد حسین آزاد نے لکھا :

" اِدھر تو یہ چونچال لڑکا شعرا کے جلسوں اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کو دل بہلا رہا تھا، اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ فورٹ ولیم

---

[1] گنج خوبی، سبب تالیف ص۳، بمبئی ۱۸۴۶ء

[2] باغ و بہار، مقدمہ ص۴، مرتبہ : ممتاز حسین، کراچی ۱۹۵۸ء

[3] نثر بے نظیر، دیباچہ ص۱۱، کلکتہ ۱۸۰۰ء

[4] اخوان الصفا، ابتدائیہ ص۶۲، مرتبہ ڈاکٹر احراز نقوی، لاہور ۱۹۶۶ء

کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اُس نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرنی ہے اس کی زبان سیکھی جائے۔"[1]

میر امن نے صاحبانِ ذی شان کے شوق کے ساتھ ساتھ یہ کہہ کر "ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں"۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اربابِ حل و عقد کے سیاسی عزائم کی نقاب کشائی کر دی، جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ نو وارد قوم کے افراد اہلِ ہند کے مزاج و عادات، رسوم و رواج اور عقائد و خیالات سے آگاہ ہو کر ملکی معاملات بخوبی انجام دے سکیں" تاکہ نظم و نسق میں یا مقدمات کے فیصلے کے وقت کوئی ایسی نہ کر بیٹھیں جو اگرچہ انگریزی قانون کے مطابق ہو لیکن رعایا کے مسلمہ عقائد کے بالکل برخلاف ہو۔[2]

لیوس ایف۔ اسمتھ نے تو باغ و بہار کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں یہاں تک لکھ دیا:

"ہندوستان پر ہماری گرفت اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک ہمارے فوجی اور سول ملازمین ہندوستان کی زبان میں مہارت نہ پیدا کر لیں، کیونکہ یہ زبان راس کماری سے ہردوار اور لاہور سے چٹاگانگ تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔"[3]

دوسری جانب لسانی اختلاف کی بنا بھی رکھ دی گئی اور علاقائی ادب کی تربیت و پرداخت کی آڑ میں کالج کے نصاب میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی[4] (اردو + ہندی)

---

[1] آبِ حیات ص ۲۵ لاہور ۱۹۵۷ء

[2] آرائشِ محفل، شیر علی افسوس، انتقاد ص ۴۸ سید عابد علی عابد لاہور ۱۹۶۳ء

[3] باغ و بہار کا قدیم انگریزی ترجمہ' از عابد رضا بیدار مشمولہ نوائے ادب ص ۳۹ بمبئی بابت جولائی ۱۹۶۰ء

[4] گارساں دتاسی لکھتا ہے "ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو اور ہندوستانی ایک ہی نام ہے، مؤخر الذکر نام یورپینوں کا دیا ہوا ہے۔" مقالات گارساں دتاسی جلد دوم ص ۸ دہلی ۱۹۴۳ء

بنگلہ[1]، تلنگی، پنجابی[2]، مرہٹی اور تامل زبانیں شامل کر لی گئیں۔ ہندوستانی زبان کے پس پردہ ایک نئی زبان بنائی گئی جسے ہندی کا نام عطا کیا گیا۔ بقول عبداللہ یوسف علی[3] "شری للو لعل نے ٹھیٹھ ہندی میں جو نثر لکھی اُس نے ایک مصنوعی زبان کی بنیاد ڈالی ..... جو اس زبان سے جو عام طور پر بولی جاتی تھی بالکل علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔"

اس نئی زبان کا نام "کھری ہندی"[4] تجویز کیا گیا جس میں عربی اور فارسی کا داخلہ ممنوع قرار پایا۔

میر امن اور آزاد نے اشارۃً اور ان کے بعد آنے والوں نے کھل کر فورٹ ولیم کالج کے سیاسی اغراض و مقاصد پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ انیسویں صدی کے ایک ذی علم بزرگ راجہ شیو پرشاد 'ستارۂ ہند' لکھتے ہیں:[5]

---

[1] بنگلہ زبان کے ارتقا پر بحث کرتے ہوئے آر سی مجمدار لکھتے ہیں: "انیسویں صدی سے قبل بنگالی زبان میں نثری ادب کا کوئی وجود نہیں تھا۔ بنگالی نثر کی ابتدا ۱۸۰۰ء میں اس وقت ہوئی جب کہ انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ اس کالج میں ولیم کیری کی سرکردگی میں بنگالی شعبہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۰۱ء تا ۱۸۰۷ء میں بنگالی کی متعدد کتابیں تالیف کی گئیں۔ کیری خود بھی کئی کتابوں کا مصنف و مؤلف ہے ان میں بنگالی زبان کی قواعد اور بنگالی انگریزی لغت بھی شامل ہے۔" ہسٹری آف فریڈم موومنٹ، جلد اول، صفحہ ۲۰۴-۲۰۵

[2] لالہ کاشی راج کھتری لاہوری پنجابی شعبے میں منشی مقرر کیے گئے۔ پنجابی زبان کی پہلی قواعد کالج کے مطبع سے ۱۸۱۴ء میں طبع ہوئی۔ 'انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۳۹۶ پروفیسر جاوید نہال' "فورٹ ولیم کالج" سید سبطِ حسن، مشمولہ سہ ماہی اردو کراچی ص ۱۰ بابت جنوری ۱۹۶۶ء۔

اس صرف و نحو کے مؤلف پادری ولیم کیری ہی تھے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ولیم کیری ایک مایۂ ناز مسیحی مشنری و مصلح کی سرگزشت ص ۲۱۳ از ایس۔ ایم۔ بنگھ طبع دوم لاہور ۱۹۶۰ء

[3] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۳۱ کراچی ۱۹۶۷ء

[4] ہندی ادب ص ۸۹، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کراچی ۱۹۷۲ء

[5] منقول از رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے ص ۵۹-۶۰ از ڈاکٹر نیر مسعود لکھنؤ ۱۹۶۷ء

"اس اُنیسویں صدی کے شروع میں جان گلکرسٹ صاحب نے میر امن اور للّو لعل جی کو حکم دیا کہ نثر کی کتابیں اس ملک کی زبان میں ایسی تصنیف کریں جن کو پڑھ کر صاحب لوگ اس ملک والوں کی بولی سمجھ لیویں۔ دونوں مصنف بے شک حیران ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ اُن کے لیے بالکل نئی بات تھی۔ دونوں نے کتاب لکھی، لیکن دونوں کو ایک نئی زبان بنانی پڑی۔ للّو لعل نے تو پریم ساگر میں سے بالکل فارسی لفظ خارج کیے۔ یہاں تک کہ اپنے مربّی ڈاکٹر گلکرسٹ کے لیے بھی "صاحب" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ افسوس للّو لعل جی یہ بھول گئے کہ خود ان کے نام کا آدھا یعنی 'لعل' لفظ فارسی ہے۔ میر امن نے گو بعض مقام میں 'نداں' اور 'ٹُک' وغیرہ ایسے ہندی لفظ لکھے ہیں کہ جو اب استعمال میں نہیں آتے۔ تاہم 'باغ و بہار' کی ابتدا میں ایک لفظ ایسا فارسی مرکب کا لکھا ہے کہ جس سے شاید صاحب لوگوں کو تمام عمر کام نہ پڑے، یعنی دلق پوش"۔

کالج کے مصنفین اور مولفین کو بھی اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ انہوں نے جس طرزِ تحریر کو اپنایا ہے وہ ان کے ذاتی اور مروجہ ادبی اسلوب کے موافق نہیں۔ میر بہادر علی حسینی نے اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر 'نثرِ بے نظیر' دو مرتبہ لکھی، دوسری بار کے سبب تالیف میں لکھتے ہیں:

"پہلے اس سے یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بطرز سہل واسطے صاحبانِ نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ اس داستانِ شیریں کو، کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے، اس رُویّہ سے نثر کروں کہ ہر ایک زبان دان و شاعر اس کو سُن کر عش عش کرے اور اس ہیچ مداں کی ایک یادگاری دُنیا میں رہے"۔

بیسویں صدی میں سید محمد[1]، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ[2] اور دیگر مورخین ادب اُردو نے اسی بات کا اعادہ کیا ہے۔ اس طرح اُردو اور ہندی دو متوازی خطوط پر دالستہ طور پر پروان چڑھائی گئیں جن میں ایک کا رسم الخط تو فارسی تھا اور دوسری کا دیوناگری طے پایا۔ اسی تفریق نے آگے چل کر ایک مستقل نزاع[3] کی صورت اختیار کر لی۔ مشہور مستشرق گارساں دتاسی نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر یہ محسوس کر لیا تھا کہ فورٹ ولیم کالج میں ہندی اور اُردو کا اختلاف ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کھڑا کیا جا رہا ہے۔ دتاسی نے واضح طور پر اس کی نشان دہی کرنے کے ساتھ اسے ایک 'بھاری غلطی' قرار دیا تھا۔ دتاسی لکھتا ہے:[4]

"ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ حکمت عملی رہی تھی کہ اُردو کو ہندی سے علیحدہ تصور کیا جائے۔ اس باب پر اظہارِ افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فورٹ کالج کے منشیوں نے خواہ مخواہ کی جو ایک خلیج اردو اور ہندی کے درمیان پیدا کر دی ہے وہ غیر ضروری ہے۔ یہ در اصل بڑی بھاری غلطی ہو گی اگر اُردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں تصور کیا جائے"۔

کالج کا قیام: ایسٹ کمپنی کا صد سالہ دور (۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء) جہاں ایک طرف لوٹ کھسوٹ، ظلم و تشدد، سازش و دھوکہ دہی اور عیاری و مکاری کی داستانوں سے

---

[1] اربابِ نثرِ اُردو ص۱۱ حیدر آباد دکن۔ ۱۹۳۷ء

[2] تاریخ ادبِ اُردو حصہ نثر ص۲۔ لاہور ۱۹۶۷ء

[3] کالج کے سیاسی مقاصد کی تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے:

(الف) انیسویں صدی کے اہم اُردو ادارے، از خواجہ تمور حسین مشمولہ ادب لطیف لاہور (اردو نمبر) ص۲۶، ۳۰، دسمبر ۱۹۵۵ء

(ب) سید عابد علی عابد، آرائشِ محفل انتقاد ص۶۲-۶۴ لاہور، ۱۹۶۳ء

(ج) مرحوم فورٹ ولیم کالج از جمیل نقوی (مقالات نمبر) ص۱۲۹ تا ۱۰۳۱ مشرب کراچی ۱۹۵۷ء

(د) گل کرسٹ اور اس کا عہد، از عتیق صدیقی۔

[4] مقالات ص۵۴۶، ص۶۳۳

پُر ہے وہیں نوارد قوم کے چند افراد نے برصغیر کی مختلف زبانوں اور اُن کے ادب کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

اس کا اعتراف اس سرزمین کے ہر ذی علم[1] نے کیا ہے۔" وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل سے لے کر لارڈ ویلزلی تک ہر ایک انگریز حاکم اپنے اپنے عہد میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو دیسی زبانیں سکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام کرتا رہا۔ اس خصوص میں پہلی منظم کوشش وارن ہیسٹنگز کی ہے۔ اس نے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس میں زیادہ تر فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کالج کا دائرۂ عمل نہایت محدود تھا اور کمپنی کی ضرورت کے لیے بالکل ناکافی[2]۔ چنانچہ ویلزلی نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس کام کی بنیاد ڈالی۔

گورنر جنرل مارکوئیس رچرڈ ویلزلی کا دورِ حکومت یوں تو صرف سات سال (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) رہا، لیکن اس قلیل مدت میں اس کی دُور بین نگاہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مغلیہ سلطنت اور دیگر چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کا سورج غروب ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس نے وقت کے تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر جنوری ۱۷۹۹ء میں جان گلکرسٹ کے تعاون سے ایک مدرسہ " اورینٹل سیمینری " کے نام سے کلکتہ میں قائم کیا۔ بظاہر یہ ایک نیم سرکاری ادارہ تھا لیکن عملاً اس کی حیثیت ایک سرکاری درس گاہ کی تھی۔ جس کی مدتِ حیات صرف ڈیڑھ سال تھی۔ اس مدرسہ کی غرض و غایت

---

[1] (الف) سیر المصنفین صفحہ ۵۴ محمد یحییٰ تنہا طبع دوم لاہور ۱۹۴۸ء

(ب) داستانِ تاریخِ اُردو صفحہ ۲۳ حامد حسن قادری طبع سوم کراچی ۱۹۶۶ء

(ج) باغ و بہار کی اہمیت از پروفیسر حمید احمد خاں مشمولہ باغ و بہار کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ صفحہ ۲۴۷ مرتبہ سلیم اختر لاہور ۱۹۶۸ء

(د) اُردو کی نثری داستانیں صفحہ ۲۰۱ از ڈاکٹر گیان چند طبع دوم ۱۹۶۹ء کراچی

[2] اربابِ نثرِ اُردو صفحہ ۱۱

کے بارے میں ایک یادداشت بتاریخ ۲۱۔ ستمبر ۱۷۹۸ء ملتی ہے جس کی عبارت یہ ہے[1]:

" بنگال سول سروس میں بھرتی ہو کر جو نوجوان (ہندوستان) آتے ہیں ان کو منشی رکھ کر ہندوستانی زبان سیکھنے کے لیے عموماً اور فارسی سیکھنے کے لیے خصوصاً تیس روپے ماہوار کا بھتہ دیا جاتا ہے۔ لیکن منشی شاذ و نادر ہی انگریزی زبان سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے نووارد رائٹر (سول ملازم) کو پہلے ہندوستانی بول چال کی زبان سیکھنی ہوتی ہے تاکہ وہ منشی سے بات چیت کر سکے۔ اس طریقِ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منشی کی خدمات سے رائٹر بہت کم یا بالکل مستفید نہیں ہوتے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مسٹر گلکرسٹ نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ وہ نووارد رائٹروں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینے کے لیے روزانہ درس دیا کریں ... مسٹر گلکرسٹ فارسی کی ابتدائی تعلیم دینے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں "۔

اس مدرسے کے قیام کے ساتھ ہی ویلزلی نے کمپنی کے ملازمین کو اعلیٰ پیمانے پر تعلیم دلانے کا ایک جامع منصوبہ بنا کر کمپنی کے اربابِ حل و عقد کے سامنے پیش کیا تاکہ ایک کالج کا قیام عمل میں لایا جا سکے۔ ابھی کمپنی کے عہدہ دار اس پر بحث و مباحثہ ہی میں مصروف تھے کہ گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء مطابق ۱۷۔ صفر ۱۲۱۵ھ کو کالج کا افتتاح کر دیا اور اسی تاریخ کو کالج کا مسودۂ آئین و ضوابط منظور ہوا، لیکن اس دستاویز پر جو عبارت درج کی گئی وہ معنی خیز ہے[2]۔

" ہز لارڈ شپ (ویلزلی) کے حکم سے اس (دستاویز) پر ۴ رمئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دار السلطنت سرنگا پٹم میں برطانوی افواج کی شان دار فیصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ تھی "۔[3]

---

[1] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۰۸ ۔ ۱۰۹

[2] ایضاً، صفحہ ۱۳۷

[3] ایضاً، صفحہ ۱۳۷

کالج کے آئین وضوابط کے دیباچہ میں یہ عبارت درج ہے:

"خدائے قدوس کے فضل وکرم سے ہندوستان میں برطانیہ عظمیٰ کے سیاسی و فوجی اقتدار کو جو مسلسل کامیابی و کامرانی اور جنگوں میں جو پیہم فتح و نصرت نصیب ہوئی ہے اور ہندوستان و دکن کے وسیع علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ حکومت آگئے ہیں اور حالات کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط سلطنت قائم ہو گئی ہے، جو متعدد آباد اور زرخیز صوبوں پر مشتمل ہے۔ جہاں مختلف قومیں آباد ہیں، جن کے مذاہب، جن کی زبان نیز جن کے عادات و اطوار ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان سب پہ الگ الگ مختلف آئین وضوابط اور مختلف رسوم کے مطابق اب تک حکومت کی جاتی رہی ہے۔ برطانوی قوم کے مقدس فرض، اُن کے حقیقی مفاد، اُن کی عزت اور ان کی حکمت عملی کا اب یہ تقاضا ہے کہ ہندوستان کی برطانوی سلطنت کے حدود میں عمدہ عمل داری کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں۔"

ان مناسب اقدام کی وضاحت دستور العمل[1] میں اس طرح کی گئی:-

"گورنر جنرل کونسل ایسے آئین وضوابط کی تشکیل کرے کہ ہندوستان میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے سول ملازمین کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی کے لیے مقامی زبانیں سکھائی جائیں اور ان کی تعلیم کا معقول بندوبست کیا جائے۔ اُنھیں ہندوستان کی رسومات اور رواج سے بھی مکمل واقفیت ہونی چاہیے تاکہ جن علاقوں میں وہ تعینات کیے جائیں ان کا انتظام بخوبی کر سکیں اور مقامی باشندوں سے میل جول پیدا کرنے میں انھیں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ چنانچہ برٹش انڈیا کے عمدہ نظم و نسق کی خاطر رچرڈ مارکوئس ولیزلی نے مندرجہ ذیل ضوابط مرتب کیے:

[1] ولیزلی کے مراسلات ص۱۳۰ مرتبہ سڈنی اوون بحوالہ انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب ص ۵۲-۵۳، از پروفیسر جاوید نہال، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۷۰ء

(الف) آنریبل کمپنی بہادر کے جونیر سول سرونٹس کی تعلیم و تربیت کے لیے فورٹ ولیم میں ایک کالج کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔ اس کالج میں ادب، سائنس، فقہ اور ان دیگر مضامین کے شعبے کھولے جاتے ہیں جن کا جاننا سول سرونٹس کے لیے نہایت ضروری ہے اور جنہیں سیکھے بغیر برٹش انڈیا پہ عمدگی سے حکومت نہیں کی جا سکتی ہے۔

(ب) کالج کی اپنی ایک مناسب اور وسیع عمارت تعمیر کی جائے جس میں ہر مضمون کے لیے الگ شعبہ ہو اور کالج کا اپنا کتب خانہ ہو۔

(ج) گورنر جنرل کالج کے مربی اور سرپرست ہوں گے۔

(د) سپریم کونسل کے اراکین دیوانی، فوجداری عدالتوں اور نظامت کے جج کالج کے گورنر (منتظم) ہوں گے۔

(ہ) کالج فنڈ کا انتظام گورنر جنرل کے ہاتھ میں ہوگا۔ کالج کا سربراہ پرووسٹ (Provost) ہوگا جو چرچ آف انگلینڈ کا پادری ہوگا۔"

ساتھ ہی ولیزلی نے ایک طویل یادداشت (مورخہ ۱۸ اگست ۱۸۰۰ء) لندن روانہ کی جس میں کالج کے قیام کی غرض و غایت اور اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ہندوستان آنے والے ہر ملازم کو کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی کسی عہدے کے لیے موزوں سمجھا جائے۔ کالج کے اخراجات کے لیے اس نے بنگال اور میسور کی مال گزاری پر کالج ٹیکس لگانے کی اجازت بھی طلب کر لی۔[1]

کالج کے ضوابط و قوانین کی رو سے تمام نو وارد سول ملازمین کے لیے کالج میں تین سال تک تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ جہاں طلبہ کے لیے طعام و قیام کا انتظام کالج کے ذمہ تھا۔ ہر سال ۶ فروری کو کالج میں تقسیم اسناد کا جشن منایا جاتا تھا جس میں کامیاب طلبہ کو سندیں، تمغے اور نقد انعامات دیے جاتے تھے۔ اس کے بعد عام جلسے میں طلبہ کے درمیان اُردو، ہندی، فارسی اور بنگالی زبانوں میں مباحثے ہوتے۔ ۱۸۰۴ء میں ایک مباحثے کے

[1] لارڈ ولیزلی کے مراسلات، خطوط اور یادداشت مرتبہ مانٹگمری مارٹن جلد دوم ص ۳۵۴-۵۵ بحوالہ "فورٹ ولیم کالج" از سید سبط حسن مشمولہ سہ ماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۶۲ء

دوران ہنگامہ ہو گیا اور گلکرسٹ کالج سے استعفیٰ دے کر اپنے وطن روانہ ہو گئے۔

۲۹ ستمبر ۱۸۰۰ء کے کلکتہ گزٹ کے ایک غیر معمولی[1] شمارے میں کالج کے مختلف شعبوں کے پروفیسروں کے تقرر کے اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ پادری ڈیوڈ براؤن کو کالج کا پہلا پرووسٹ مقرر کیا گیا، جو کلکتہ بائبل سوسائٹی کے بانی تھے۔ جب کہ جان گلکرسٹ ہندوستانی شعبے کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد اس شعبے کے لیے منشیوں کا تقرر عمل میں آیا۔ مرزا علی لطف کے بیان کے بموجب میر تقی میر بھی کالج میں رسائی کے خواہشمند تھے۔ مرزا علی لطف لکھتے ہیں:[2]

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کو زبان دانانِ ریختہ کے مقدمے میں کلکتہ سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو پیشی میر (میر تقی) کی ہوئی، لیکن علتِ پیری سے یہ بے چارے مجہول کے محمول ہوئے اور نوجوانانِ نومشق مرتبی گری سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے۔ اکثر اہلِ لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا حمالی ہے۔"

میر کا بڑھاپا ان کی تقرری میں مانع رہا۔ لیکن ٹھیک گیارہ سال بعد اسی کالج کے مطبع ہندوستانی پریس سے کلیاتِ میر کا اولین ایڈیشن "حسب الارشاد کپتان ٹیلر صاحب مدرس ہندی و امداد تامس روبک صاحب ... بہ تصحیح مرزا کاظم علی جواں اور مرزا جان طپش و مولوی محمد اسلم و تارنی چرن متر و منشی غلام اکبر ۱۸۱۱ء میں مطابق ۱۲۲۶ ہندوستانی

---

[1] لارڈ ویلزلی کے مراسلات، خطوط اور یادداشت مرتبہ مانٹگمری مارٹن جلد دوم ص ۲۵۶، لندن ۱۸۳۶ء بحوالہ "فورٹ ولیم کالج" از سید سبطِ حسن مشمولہ سہ ماہی اُردو، کراچی ۱۹۶۶ء

[2] گلشن ہند ص ۲۰۹ بہ تصحیح مولوی عبدالحق، لاہور ۱۹۰۶ء

چھاپہ خانے میں چھاپا گیا۔"[1]

بی۔ این۔ بنرجی[2] کالج میں ہندوستانی منشیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں فارسی کے بیس ۲۰، ہندوستانی کے بارہ ۱۲، بنگالی کے چھ ۶ اور عربی کے چار ۴ منشی مقرر کیے گئے، لیکن ہندوستانی زبان کی مقبولیت کے پیش نظر جلد ہی منشیوں کی تعداد بڑھا کر پچیس ۲۵ کر دی گئی۔ گل کرسٹ کے چار سالہ عہد میں کم از کم بیالیس مصنفین، مترجمین اور منشی مختلف اوقات میں کالج کے ہندوستانی شعبے سے وابستہ رہے۔ منشیوں کی ایک اور قسم بھی تھی "جنہیں سندی منشی کہا جاتا تھا۔ انہیں باقاعدہ امتحان پاس کرنا ہوتا تھا جو کامیاب ہو جاتے انہیں سند دی جاتی تاکہ وہ طلبہ کو پرائیوٹ طور پر ٹیوشن دے سکیں۔ یہ نہ تو کالج کے ملازم ہوتے تھے اور نہ انہیں کالج کی جانب سے تنخواہ دی جاتی تھی بلکہ ان کی تنخواہ کا بار طلبہ کو اُٹھانا پڑتا تھا۔"

گل کرسٹ کے حالات : فورٹ ولیم کالج کے ہندوستانی شعبے کے سربراہ جان بارتھ وک گلکرسٹ ۱۷۵۹ء میں بمقام ایڈنبرا (صدر مقام اسکاٹ لینڈ) پیدا ہوئے۔[3] ابتدائی تعلیم کے بعد مشہور طبی درسگاہ جارج ہیریٹ ہسپتال میں داخلہ لیا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے

---

[1] قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: "میر کی وفات شعبان ۱۲۲۵ھ میں ہوئی اور کلیات ۱۲۲۶ھ میں چھپ کر شائع ہوا۔ عجب نہیں اگر میر کے دورانِ حیات ہی اس کا انطباع شروع ہو گیا ہو۔ ۱۲۲۶ھ کے بعد کلیاتِ میر کا کوئی ایڈیشن شائع ہوا ہے تو تجارتی اغراض سے۔ ہندوستان اور پاکستان کے کسی ادبی ادارے کو اس طرف توجہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ جس قدر شرمناک ہے، اسی قدر قابلِ ستائش ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل و عقد کو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو سال قبل کلیات کی اشاعت کا خیال آیا۔"
"کلیاتِ میر کی اولین اشاعت" مشمولہ دلی کالج میگزین
(میر نمبر) ص ۹۱-۳۸۱۔ دہلی ۱۹۶۲ء

[2] ڈان آف نیو انڈیا، صفحہ ۱۰۲، کلکتہ ۱۹۲۷ء

[3] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۶۳

کوئی طبی سند حاصل کی یا نہیں۔ عتیق صدیقی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات کی چھان بین کے بعد یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ ان میں کہیں بھی ان کے نام کے ساتھ لفظ ڈاکٹر درج نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی وہ تمام تصانیف جو ۱۸۰۵ء تک ہندوستان میں طبع ہوئیں ان میں بھی کسی کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر درج نہیں۔ ڈاکٹر کی اعزازی سند انہیں ہندوستان سے مراجعت کے بعد ایڈنبرا یونیورسٹی نے ان کی علمی خدمات کے صلے میں عطا کی۔

حصولِ علم کے بعد گلکرسٹ نے ویسٹ انڈیز کی راہ لی۔ چند سال وہاں قسمت آزمائی کے بعد انہوں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ یہاں پہنچ کر انہیں جس چیز نے اپنی طرف متوجہ کیا وہ یہاں کی زبان کی وسعت و ہمہ گیری تھی۔ اپنی لغت و قواعد کے ضمیمہ میں گلکرسٹ لکھتے ہیں: [۱]

"۱۷۸۲ء میں بمبئی میں وارد ہوتے ہی میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا قیام خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ تو میرے لیے ہی خوشگوار ہو سکتا ہے اور نہ میرے آقاؤں کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں پوری دست گاہ میں نہ حاصل کر لوں ..... چنانچہ ..... میں جم کر بیٹھ گیا ..... خوش قسمتی سے اپنے دوست کپتان جسان ریٹ رے سے ..... سودا کا کلیات مجھے مل گیا۔ ہندوستانی میں اس وقت (۱۷۹۰ء) تک جو مہارت میں نے حاصل کی ہے، اس کے لیے کلیاتِ سودا اور اسی کریم النفس انسان (ریٹ رے) ..... کا میں بیحد ممنون ہوں۔"

اس کے بعد گلکرسٹ ایسا جم کر بیٹھا کہ صرف دو سال کی قلیل مدت میں اس نے مروجہ زبان میں اتنی دست گاہ اور استعداد پیدا کر لی کہ اس زبان کے طالب علم سے وہ مؤلف، مصنف اور آخر میں معلم کی صف میں جا پہنچا۔ یہ سلسلہ کم و بیش بائیس[۲۲] سال تک ہندوستان

---

[۱] گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۹۶

میں جاری رہا۔ کالج کی دستاویزات کے مطابق ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ نے اپنی "ناگہانی اور شدید علالت" کا عذر پیش کر کے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جو دوسرے ہی دن منظور کر لیا گیا۔ عتیق صدیقی نے اپنی گراں قدر کتاب "گلکرسٹ اور اس کا عہد" میں استعفے کی یہی وجہ درج[۱] کی ہے، جسے بعد کی تحقیقات کی روشنی میں خود انہوں نے کالعدم قرار دیا ہے۔ اُن کے ایک مضمون "گلکرسٹ اور اس کا عہد۔ ایک گم شدہ کڑی"[۲] سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم[۳] اسناد کے سالانہ جلسہ کے بعد تقریری مقابلے کے لیے گلکرسٹ نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا جس سے کلکتہ کے مسلمانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی اور انہوں نے گورنر جنرل کو ایک یادداشت پیش کی جس میں حکومت کو یاد دلایا گیا تھا کہ "کمپنی بہادر کی حکومت نے ہندوستانیوں سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان کے مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔"

"لارڈ ویلزلی نے مجوزہ موضوع کو جس کی وہ خود بھی منظوری دے چکا تھا، مسترد کر دیا .... گلکرسٹ کو یہ بات اس قدر ناگوار گزری کہ طیش میں آ کر اس نے استعفیٰ دے دیا اور اپنے وطن ایڈنبرا چلا گیا۔"

۱۸۱۶ء میں کمپنی نے اپنے ملازمین کو اُردو سکھانے کے لیے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ نامی ایک ادارہ قائم کیا اور گلکرسٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہاں ایک بار پھر کمپنی کی بنیا شاہی آڑے آئی اور ۱۸۲۵ء میں یہ ادارہ ختم کر دیا گیا، لیکن گلکرسٹ اسے ذاتی طور

---

[۱] گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۸۵

[۲] محمد عتیق صدیقی ، اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۱۴ ص ۵۷ تا ۶۶، اکتوبر ۱۹۶۳ء

[۳] یہ مجلسِ مباحثہ گورنر جنرل کے محل کے اس کمرے میں منعقد ہوئی جہاں شہنشاہ ہند کے نمائندے کے سامنے ملک کے خراج گزار راجہ اور نواب اظہار عقیدت کے لیے جمع ہوتے تھے .... اس مباحثے میں گورنر جنرل ویلزلی .... عدالتِ عالیہ کے چیف جسٹس، تمام ججوں اور اعلیٰ فوجی اور سول حکام کے علاوہ بغداد کے سفیر سلیمان آغا بھی شریک تھے۔" ولیم کیری۔ ایک مایۂ ناز مسیحی مشنری و مصلح کی سرگزشت ص ۲۰۰ از ایس ایم سنگھ طبع دوم، لاہور ۱۹۶۰ء

ایک سال تک جاری رکھنے کے بعد ایڈنبرا چلے گئے۔ اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی چنانچہ علاج و تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے پیرس پہنچے، جہاں ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو بعمر بیاسی سال[1] انتقال کیا۔[2]

ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد پروفیسر جیمس موبٹ عارضی طور پر ہندوستانی شعبے کے سربراہ مقرر کیے گئے۔ ان کے بعد کے جن سربراہوں کے نام معلوم ہو سکے وہ درج ذیل ہیں۔[3]

جے۔ ایچ۔ ہارنگٹن ۔ جوزف ٹیلر۔ ٹامس روبک ۔ ابراہیم لاکٹ۔

گلکرسٹ نے کالج کے چار سالہ قیام کے دوران خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں جن کی تعداد تریسٹھ ہے۔[4] ان مصنفین، مولفین اور مترجمین میں ہندوستانی شعبے کے منشی اور غیر ملازم دونوں شامل ہیں۔ مولوی حفیظ الدین (خرد افروز) اور مولوی نور علی بن نذر علی (بہارِ عشق) کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج کی جانب سے کتابوں کی ضرورت سے متعلق اشتہارات بھی شائع کیے جاتے تھے۔

---

۱ اربابِ نثرِ اردو ص ۲۳، داستانِ تاریخِ اردو ص ۸۵،

۲ ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد ان کی بیوہ نے جنرل پپ سے شادی کر لی۔ اس خاتون نے ۱۸۶۵ء میں اپنی وفات کے وقت اپنے وطن اسکاٹ لینڈ کی مشہور ایڈنبرا یونیورسٹی کے نام ساڑھے سات ہزار فرانک سالانہ کی آمدنی چھوڑی تھی اور یہ وصیت کی تھی کہ اس رقم سے تین وظیفے قائم کیے جائیں اور یہ وظیفے ایسے تین ہندوستانی طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے دیے جائیں جو صوبجات بنگال، مدراس اور بمبئی کے باشندے ہوں اور یہ وضاحت بھی کر دی تھی کہ ان تینوں صوبوں میں جتنے مشہور کالج ہیں ان کے طلبہ میں سے تین بہترین طلبہ کو مقابلے کے ذریعے سے منتخب کر کے یہ وظیفے دیئے جائیں"۔ گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اردو ص ۱۱۶-۱۱۷ از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، طبع دوم، حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء

۳ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۷۷۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ ص ۱۵۵ ڈاکٹر وحید قریشی۔ لاہور ۱۹۶۵ء

۴ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۳۸

مولوی حفیظ الدین 'خرد افروز' کے دیباچے[1] میں لکھتے ہیں:

"فدوی نے حکم اشتہار سن کر عیار دانش کو کہ فی الحقیقت، جواہر بے بہا ہے اور اب تک جواہر خانۂ فارسی میں مقفل تھی، بہ کلیدِ کوشش سے کھول کر زبانِ ریختہ میں آب و تاب دیے اردوئے معلیٰ میں جلوہ گر کی۔"

مذکورہ عبارت 'خرد افروز' اس کے اس قلمی نسخے میں درج ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ) کے کتب خانے میں محفوظ ہے جب کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ عبارت "بحکم جان گلکرسٹ صاحب"[2] میں تبدیل کر دی گئی ہے۔

مولوی نور علی 'بہارِ عشق' کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:[3]

"اکثر اشخاص کونسل اشتہار کے بموجب کتب فارسی زبان ریختے میں ترجمہ کرتے ہیں.... اور سُرخ رُوئی حاصل کرتے ہیں۔ اگر تم بھی کسی کتاب کا ترجمہ کر کے کونسل میں نذر گزرانو تو . . . . اس خاکسار نے نل دمن فیضی کا مطلب (بعنوان بہارِ عشق) لکھا..."

مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے منظور شدہ کتابوں پر نقد انعام بھی دیا جاتا تھا۔ کالج کے ملازمین کو کم اور غیر ملازمین کو زیادہ۔ گلکرسٹ کی علیحدگی کے بعد مزید سولہ سال یعنی ۱۸۲۰ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح مختلف موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ سو[4] کتابیں تالیف و تصنیف ہوئیں۔

ہندوستانی پریس: گل کرسٹ نے کالج کے قیام کے فوراً بعد چھاپے خانے کے قیام کی ضرورت محسوس کی جو اعلیٰ پیمانے پر طباعت کا کام انجام دے سکے۔ چنانچہ ۲ جنوری ۱۸۰۱ء کو اس نے کالج کونسل کے سیکرٹری سے اس سلسلے میں مراسلت[5] کر کے یہ تجویز منظور کروالی اور

---

۱ منقول از انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب ص ۲۰۸

۲ خرد افروز دیباچہ مصنف ص ۴۔۵ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور ۱۹۶۳ء

۳ منقول از انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب، ص ۳۹۰

۴ ایضاً، ص ۷

۵ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۱

ہندوستانی پریس کے نام سے اس نے کالج کے احاطے میں یہ مطبع قائم کیا۔

عتیق صدیقی اپنی ایک اور گراں قدر کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" میں لکھتے ہیں:[1]

"کلکتہ کے انگریزی اخباروں کے ان چھاپہ خانوں کو اگر ہم نظر انداز کر دیں، جہاں فارسی رسم الخط کے ٹائپ موجود تھے، تو فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ تجارتی چھاپہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں شروع ہوا۔ اس کا نام ہندوستانی پریس تھا۔"

اختر شہنشاہی کے مؤلف اختر الدولہ سید محمد اشرف[2] سیتاپوری کے حوالے قاضی محمد الیاس[3] سیتاپوری اور ان کے حوالے سے نادم سیتاپوری[4] اور ڈاکٹر احراز نقوی[5] سیتاپوری نے کالج کے ایک منشی مولوی محمد اکرام علی سیتاپوری کو اس مطبع کا مالک قرار دیا ہے۔ عتیق صدیقی ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ چھاپہ خانہ گلکرسٹ نے ۱۸۰۲ء میں قائم کیا اور وہی اس کے مالک تھے۔ وطن واپسی کے وقت گلکرسٹ نے یہ چھاپہ خانہ اور اپنی تمام نامکمل کتابیں ڈاکٹر ہنٹر، مسٹر میک ڈوگل اور میکن ٹوش فلٹن اینڈ کمپنی کی مشترکہ نگرانی میں دے دیا تھا۔ عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

"ہندوستانی اخبار نویسی میں اس خیال (ملکیت) کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ..... فارسی رسم الخط کا پہلا باضابطہ چھاپہ خانہ ۱۸۰۱ء کے اواخر یا ۱۸۰۲ء کے اوائل میں قائم ہوا ...... اب میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ مولوی اکرام نے نہیں بلکہ گل کرسٹ نے یہ چھاپہ خانہ قائم کیا تھا۔"

یہ چھاپہ خانہ گلکرسٹ نے ضرور قائم کیا تھا لیکن وہ اس کا مالک نہیں تھا جس کا ثبوت

---

[1] 'ہندوستانی اخبار نویسی' ص ۴۳ دہلی ۱۹۵۷ء

[2] اختر شہنشاہی بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵۱

[3] ماہنامہ اناظر لکھنؤ بابت نومبر ۱۹۱۳ء، بحوالہ اخوان الصفا' مقدمہ ص ۲۰، از ڈاکٹر احراز نقوی لاہور ۱۹۶۶ء

[4] فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۵۶ تا ۱۶۹

[5] اخوان الصفا مقدمہ ص ۲۰

گلکرسٹ کا ۳۰ جنوری ۱۸۰۱ء کا وہ مراسلہ ہے جسے عتیق صدیقی نے اپنی اسی کتاب (گلکرسٹ ص ۱۵۱) میں درج کیا ہے، جس میں اس نے لکھا تھا:

"مسٹر فرانسس گلیڈون نے ٹائپ اور طباعت کا دوسرا سامان کالج کونسل کو دیا ہے غالباً اس سے بہتر سامان اس وقت دستیاب نہیں ہو سکتا۔ مستدعی ہوں کہ کالج کونسل کے سامنے آپ میری اس خواہش کا اظہار کر دیں کہ ہندوستانی زبان کی جو کتابیں میں عنقریب چھاپنے والا ہوں ان کی طباعت کے سلسلے میں اس سامان کو اپنی تحویل میں لے کر اپنے شعبے کے کام میں لانا چاہتا ہوں — عندالطلب اس کو بہ تمام و کمال واپس کرنے کا میں وعدہ کرتا ہوں — میری تحویل کے دوران میں اس میں سے کچھ اگر ضائع ہوا تو میں اس کو پورا کر دوں گا۔"

اس مراسلے سے صاف ظاہر ہے کہ گلکرسٹ اس مطبع کا مالک نہیں[1] تھا۔ اس کی علیحدگی اور کالج کے خاتمے کے بعد بھی یہ پریس جاری رہا جس سے وقتاً فوقتاً کتابیں شائع ہوتی رہیں، جو آج بھی برصغیر اور انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں۔ کالج کے خاتمے کے بعد، قیاس غالب ہے کہ یہ چھاپہ خانہ حکومت ہند کی تحویل میں چلا گیا تھا جس کا ثبوت مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانۂ عجائب کا وہ ایڈیشن ہے جو ہندوستانی پریس سے ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں طبع ہوا تھا۔[2] اس ایڈیشن کو گورنمنٹ ہند صیغۂ ہوم ڈپارٹمنٹ کے حکم سے باہتمام میجر ڈبلیو ناسولیس صاحب بہادر

---

[1] پروفیسر جاوید نہال نے ڈاکٹر ولیم ہنٹر کو اس کا مالک قرار دیا ہے۔ ۱۸۱۱ء میں جب ہنٹر جاوا چلا گیا تو ڈاکٹر ولسن اس کے مالک ہوئے۔ بعد میں ٹامس روبک بھی ان کے شریک کار ہو گئے۔ ۱۸۲۸ء کے بعد یہ چھاپہ خانہ ایک "دوسرے شخص" کے ہاتھ میں چلا گیا۔ بنگال کا اردو ادب ص ۶۳ پروفیسر نہال نے جتنے نام گنوائے ہیں وہ سب اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نام چھاپہ خانہ کی مختلف مطبوعات پر ملتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام حضرات یکے بعد دیگرے پریس کے مالک رہے ہیں۔ اگر اس استدلال کو تسلیم کر لیا جائے تو مولوی اکرام علی کے علاوہ کالج کے درجنوں منشیوں کو بھی اس کا مالک قرار دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ ان میں بہت سوں کے نام نگراں یا مہتمم کی حیثیت سے کتابوں کے سرورق پر درج ہیں۔

[2] بحوالہ فسانۂ عجائب ص ۴۵ مرتبہ اطہر پرویز' الہ آباد ۱۹۶۹ء

سیکریٹری، بورڈ آف اگزامنز، کالج پریس (ہندوستانی پریس) میں چھاپا۔ صاحبانِ عالی شان کی ڈگری کے امتحان کے لیے۔"

مذکورہ بالا استشہادتوں کی روشنی میں یہ مطبع نہ تو گلکرسٹ اور نہ مولوی اکرام علی سیتاپوری کی ملکیت ثابت ہوتا ہے، بلکہ یہ چھاپہ خانہ کالج کی ملکیت تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے مہتمم بدلتے رہتے تھے جن کے نام کتابوں کے سرورق پر شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کو مہتمم KEEPER OF THE PRESS کہتے ہیں جو ضروری نہیں کہ مطبع کا مالک بھی ہو۔

کتب خانہ: فورٹ ولیم کالج کی تاریخ کتب خانے کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی، کیونکہ یہ کتب خانہ انڈیا آفس لائبریری کا وہ نقش اول[1] ہے جس کی تدوین جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد شروع ہو گئی تھی اور کمپنی کے آدمی صرف کلکتہ ہی نہیں بلکہ دہلی، حیدرآباد، لکھنؤ، مرشدآباد وغیرہ میں قلمی کتابیں اور نوادرات تلاش کرتے تھے۔"

سرنگاپٹم کی تسخیر اور ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء کے بعد اس کا کتب خانہ[2] جو نوادراتِ علمی سے معمور تھا انگریزوں کی تحویل میں آگیا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اس کی نصف کتابیں کالج کے کتب خانہ میں منتقل کر دی گئیں۔ اور بقیہ کتب آکسفورڈ، کیمبرج اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کو بخش دی گئیں۔

ابتداء میں طلبہ کو کتابیں گھر لے جانے کی اجازت تھی، نگران کی لاپروائی سے جب نادر و نایاب مخطوطات اور مطبوعات ضائع ہونے لگے تو ۱۸۰۸ء میں کتابیں باہر لے جانے پر پابندی عاید کر دی گئی۔ کالج کی دوسری دہائی تک اس کتب خانے میں ہندوستانی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ترکی کے مخطوطات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا۔ بقول بی۔ این بنرجی[3]

۱؎ انڈیا آفس لائبریری کے قیام کا منصوبہ ۱۷۹۸ء میں بنایا گیا اور ۱۸۰۱ء میں اُسے عملی جامہ پہنایا گیا۔ دیکھیے "انڈیا آفس لائبریری" (پس منظر) روزنامہ امروز، ۱۹۔ دسمبر ۱۹۷۳ء

۲؎ اس کتب خانہ سے متعلق تفصیلی معلومات کے لیے دیکھیے: "کتب خانہ ٹیپو سلطان" از حکیم محمود احمد برکاتی، مشمولہ سہ ماہی الزبیر بہاولپور، ص ۶۲ تا ۷۷، شمارہ ۱، ۱۹۶۷ء

۳؎ ڈان آف نیو انڈیا، صفحہ ۱۰۷

کتابوں کی کل تعداد ۲۱۱۶۷ تھی اس میں مطبوعہ مغربی کتابیں ۵۲۲۴، مطبوعہ مشرقی کتابیں ۱۱۷۱۸ اور مخطوطات کی تعداد ۴۲۲۵ تھی۔

کتب خانہ کے پہلے مہتمم[1] منشی غلام حیدر کا تقرر ۱۸۰۱ء میں ہوا، دوسرے منشی موہن پرشاد اور تیسرے مہتمم مولوی اکرام علی تھے۔

کالج کے خاتمہ سے پہلے ۱۸۳۶ء میں پہلے تمام مخطوطات اور اس کے بعد تمام مطبوعات انڈیا آفس لائبریری منتقل کر دی گئیں۔ اس طرح یہ عظیم الشان نادر و نایاب مشرقی ورثہ مغرب کی تحویل میں پہنچ گیا۔

کالج کا خاتمہ: لارڈ ولزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس انتظامیہ کی منظوری کے بغیر کالج کے قیام کا ایک شاندار خاکہ تیار کیا تاکہ آگے چل کر اسے یونیورسٹی[2] کا درجہ دیا جا سکے، لیکن ابھی اس کے قیام کو صرف چودہ مہینے ہی گزرے تھے کہ کمپنی کی بنیاشاہی نے ۲۷۔ جنوری ۱۸۰۲ء کو یہ فیصلہ کیا کہ کالج فوراً بند کر کے اورینٹل سیمینری دوبارہ بحال[3] کی جائے۔ کمپنی کے اربابِ بست و کشاد اسے ایک سفید ہاتھی تصور کر کے کالج کے وجود کو بدتر فضول سمجھتے تھے۔ لیکن ولزلی نے اس کی سختی سے مخالفت کی اور ایک طویل یادداشت انگلستان روانہ کی جس میں اس نے یہ دھمکی دی تھی:

"میرا یہ قطعی اور مصمم ارادہ ہے کہ اگر مجلس نظماء نے کالج توڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا تو انگلستان لوٹتے ہی پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ قانون کے ذریعے کالج کی تجدید کی جائے۔"

یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے ایک اور مراسلے میں ایسی بات لکھ دی جس کے نتیجے میں اسے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آئی[4]۔ وہ لکھتا ہے:

۱؎ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی ص ۱۶۹ نادم سیتاپوری، لکھنؤ ۱۹۵۹ء

۲؎ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۸

۳؎ ولزلی کے مراسلات ص ۶۴۰ بحوالہ سہ ماہی اردو کراچی ص ۱۰۳، جنوری ۱۹۶۶ء

۴؎ ایضاً

"اس معاملے میں کورٹ آف ڈائرکٹرز سے حکم کی اگر تعمیل کی جاتی، تو اس وقت جو فتنے برپا ہوتے وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کالج کو قائم رہنا ہوگا ورنہ سلطنت ختم ہو جائے گی۔"[1]

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۲ ستمبر ۱۸۰۳ء کو مجلس نظماء نے "تا حکم ثانی" کالج کو جاری رکھنے کی منظوری دے دی، لیکن ساتھ ہی کچھ ایسی پابندیاں بھی عاید کر دیں کہ ۱۸۰۵ء میں لارڈ ویلزلی کے انگلستان چلے جانے کے بعد ان کے جانشینوں میں کوئی ایسا با اثر شخص نہیں تھا جو کمپنی کے اربابِ حل و عقد کے فیصلوں کا مقابلہ کر سکتا۔

ویلزلی کے لندن پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ۲۱ مئی ۱۸۰۶ء کو انگلستان میں ہیلی بری کالج قائم کیا گیا۔ اس درسگاہ کے اغراض و مقاصد بھی وہی تھے جو فورٹ ولیم کالج کے تھے جس کی براہِ راست زد کلکتہ کالج پر پڑی اور جنوری ۱۸۰۷ء میں کالج کے اخراجات کم کر دیے گئے۔ پرووسٹ اور نائب پرووسٹ کے عہدے ختم کر دیے گئے۔ تین سال کے تعلیمی کورس کی جگہ ایک سال کا نصاب رائج کیا گیا جس کے نتیجے میں بیشتر منشیوں اور پنڈتوں کو برطرف کر دیا گیا۔

لارڈ ولیم بنٹنگ (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۵ء) کے عہد میں کالج کے مصارف میں مزید کمی کر دی گئی۔ ۱۸۳۰ء کے بعد ۲۴ سال تک یہ کالج نزاع کے عالم میں رہا۔ آخر کار جنوری ۱۸۵۴ء میں فورٹ ولیم کالج کو بورڈ آف اگزامنرز میں ضم کر دیا گیا اور نصف صدی (۵۴ سال) بعد کالج کا خاتمہ ہو گیا۔[2]

ادبی خدمات: انسانی تاریخ بھی ایک عجوبۂ روزگار ہے، جس میں ہم بسا اوقات بہت سی متضاد صورتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں تناقضات کا نام دیتے ہیں جنہیں ہم آسانی کے ساتھ سرسری بیانات سے رد نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ کہہ دینا کہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد یہ تھا کہ 'صاحبانِ ذی شان' آسان اور عام فہم زبان سیکھ کر "پھوٹ ڈالو اور

---

[1] ویلزلی کے مراسلات ص ۲۴۹ بحوالہ سہ ماہی اُردو کراچی ص ۱۰۲، جنوری ۱۹۹۶ء۔

[2] ڈان آف نیو انڈیا، صفحہ ۱۲۴

حکومت کرو" کے بدنام زمانہ نظریہ پر بخوبی عمل پیرا ہو سکیں تو یہ تاریخی اور ادبی بددیانتی ہوگی۔

فورٹ ولیم کالج کی تالیفات میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شعوری طور پر ایسی زبان استعمال کی گئی جو روایتی عبارت آرائی، تصنّعات اور تکلّفات سے پاک تھی۔ بیان بیان کی سادگی اور اسلوب کے براہِ راست انداز پر زور دیا گیا۔ روایتی طوالت کو ترک کر کے ایجاز و اختصار کو اپنایا گیا۔ اس اجتہاد نے اُردو نثر کو ایسی دلآویزی، قوت اور توانائی عطا کی جو اردو ادب میں ایک نئے دور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کی کوکھ سے سرسید تحریک نے جنم لیا اور جس نے بقول[1] مولوی عبدالحق:

> "زبان (اُردو) کو پستی سے نکالا، انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا، سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے ... (سرسید نے بھی گلکرسٹ کی طرح) خود بھی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں ..."

سرسید احمد خاں نے جس سادہ اسلوب اور بقول علی سردار جعفری "جمہوری ادب"[2] کی بنیاد رکھی وہ بلاشبہ اہم ہے لیکن یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ان کی نثر فورٹ ولیم کالج کے سادہ اسلوب کا نقشِ ثانی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ کالج کے ہندوستانی منشیوں نے ایسی نثر کی بنا ڈالی جس کی پرکاری اور دلآویزی نے اُردو ادب میں ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی اور اُردو کو برصغیر پاک و ہند کی عمومی زبان کا درجہ دے کر اُسے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اسی تاریخ ساز کارنامے کے سبب اردو ادب کی کوئی تاریخ فورٹ ولیم کالج کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی۔

---

[1] سرسید احمد خاں (حالات و افکار) ص ۳۰ طبع اول کراچی

[2] ترقی پسند ادب ص ۹۵ جلد اول بمبئی ۱۹۵۱ء

ضمیمہ

سوانحی خاکہ

پروفیسر سیّد وقار عظیم :

۱۹۶۶ء

آپ کو دی خدا نے طبعِ حلیم
آپ پر خاص فضلِ ربِّ کریم
آپ دیتے ہیں سب کو درسِ حیات
آپ کا در ہے گویا بابِ نعیم
عظمتوں کے جہاں میں آپ عظیم
تشنگانِ ادب کے دل میں مقیم
ناز ہے ہم کو آپ پر لاریب
واقعی آپ ہیں وقارِ عظیم

۱۹۷۶ء

اب خدا کے وہ ہو گئے زہرا
میرے اور آپ کے وقارِ عظیم

۱۹۸۶ء

آپ کے فیض سے ملے مجھ کو
علم و ادراک اور قلبِ سلیم
ایک ایسی کتاب لکھ پاؤں
جس کا عنوان ہو "وقارِ عظیم"

——— زہرا معین

وطن : قصبہ انبیٹھہ، تحصیل گنگوہ، ضلع سہارنپور

ولادت : الہ آباد، دسمبر ۱۹۰۹ء

دادا : سید فضلِ عظیم، ڈپٹی کلکٹر، ہمیر پور، کانپور [فارسی اور اردو کے نعت گو شاعر]

نانا : ادیب میرٹھی [صاحبِ دیوان غزل گو شاعر]

والد : سید مقبول عظیم عرشؔ (ولادت ۸۳-۱۸۸۲ء، وفات مئی ۱۹۳۵ء)

حقیقی والدہ : انتقال، میرٹھ، ۱۹۲۲ء

دوسری والدہ : (سگی خالہ، کلثوم بیگم)، وفات مارچ ۱۹۳۵ء

بھائی بہن : پروفیسر اقبال عظیم (ولادت ۸-جولائی ۱۹۱۳ء)، کراچی
مسعودہ بیگم (ولادت ۱۹۱۶ء)، بیگم محمود رضوی، کراچی
معراج عظیم (ولادت ۱۹۱۹ء، وفات، کراچی ۱۹۵۰ء)

دوسری والدہ سے بہن بھائی :

محبوب مشیر مرحوم، بیگم مشیر احمد علوی، دہلی،
احمد عظیم، دہلی، حامد عظیم، دہلی

تعلیم : کانپور، اُناؤ، لکھنؤ، الہ آباد، علی گڑھ
بی۔اے، لکھنؤ: ۱۹۳۲ء، ایم-اے (اُردو) الہ آباد: ۱۹۳۴ء، بی۔ٹی علیگڑھ ۱۹۳۶ء

بعض اساتذہ :

اُناؤ : مولوی انوار الحق۔

لکھنؤ : حامد اللہ افسر میرٹھی، علی عباس حسینی، اختر علی تلہری

الہ آباد : ڈاکٹر ضامن علی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر اعجاز حسین،
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زبید احمد، نعیم الرحمٰن،
فراق گورکھپوری، پروفیسر دھیرندر ورما۔

علی گڑھ : ڈاکٹر خواجہ غلام السیّدین، چوہدری عبدالغفور،
پروفیسر محمد بشیر۔

شادی : لکھنؤ، ۲۷- دسمبر ۱۹۳۸ء

خسر : عابد حسین خاں (کوتوال آگرہ)، وفات: علی گڑھ ۹- دسمبر ۱۹۷۶ء

اہلیہ : بیگم عابدہ وقار، لاہور

بیٹیاں : مسز نیّر محبوب، کراچی، مسز تنویر راشد لاہور، مسز کوثر ارتضٰی حیدر، لاہور

بیٹے : انور وقار عظیم، لاہور؛ اختر وقار عظیم، اسلام آباد؛ اطہر وقار عظیم، کراچی؛ اظہر وقار عظیم، اسلام آباد؛ اصغر وقار عظیم، کیلیفورنیا، امریکہ۔

منصبی، علمی اور تہذیبی معروفیات :

اُستاد شعبۂ اُردو، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۴ء

اُستاد: جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ۱۹۳۸ء—۱۹۴۲ء

اُستاد: دہلی پالی ٹیکنیک، گورنمنٹ آف انڈیا، دہلی ۱۹۴۲ء—۱۹۴۶ء

مُدیر : آج کل، دہلی ۱۹۴۶ء—۱۹۴۷ء

مُدیر : ماہِ نو، کراچی ۱۹۴۸ء—۱۹۵۰ء

مُدیر : نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱—۱۸

مُدیر : اُردو، کراچی بابائے اُردو نمبر ۱۹۶۲ء

اُستاد شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور فروری ۱۹۵۰—ستمبر ۱۹۷۶ء

صدر شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۵ء—۱۹۶۶ء

پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور ۱۹۶۵ء

غالب پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء—ستمبر ۱۹۷۰ء

نگران: ادارۂ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۴ء—۱۹۷۱ء

رکن : مجلسِ ادارت تاریخ ادبیاتِ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

رکن : نصاب ساز کمیٹی، حکومتِ پاکستان۔

رکن : مجلسِ استناد محکمۂ زبانِ دفتری، مغربی پاکستان

رکن : منتظمہ مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور

رکن : بزمِ اقبال، لاہور

خازن : اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور

جج : آدم جی ادبی انعام، پاکستان رائٹرز گلڈ، لاہور

مشیر (اُردو) : پنجاب پبلک سروس کمیشن، لاہور

بعض اہم مطبوعات و مرتبات :

۱- ہمارے افسانے، ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۰ء، ۱۹۶۷ء

۲- (فن) افسانہ نگاری ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۰ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۷ء

۳- انتخابِ مومن (مع مقدمہ و تذکرہ) ۱۹۴۲ء، ۱۹۵۱ء

۴- انشا کی تعلیم ۱۹۴۳ء

۵- نیا افسانہ ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۷ء، ۱۹۷۷ء

۶- علامہ راشد الخیری، ۱۹۴۶ء

۷- باغ و بہار (مع مقدمہ)، ۱۹۵۲ء

۸- الف لیلیٰ سرشار، انتخاب مع مقدمہ، ۱۹۵۲ء

۹- آغا حشر اور ان کے ڈرامے، ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۷ء، ۱۹۸۰ء

۱۰- ہماری داستانیں، ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۸۰ء

۱۱- اندر سبھا و شرح اندر سبھا، ۱۹۵۷ء

۱۲- داستان سے افسانے تک، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۸۰ء

۱۳- فردوس بریں (ترتیب مع مقدمہ)، ۱۹۶۲ء، ۱۹۶۷ء

۱۴- فن اور فنکار، ۱۹۶۶ء

۱۵- نقلیات (میر بہادر علی حسینی)، مئی ۱۹۶۶ء

۱۶- اقبال — شاعر اور فلسفی، ۱۹۶۸ء

۱۷- مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین (۱۹۲۵ء—۱۹۷۰ء)، لاہور ۱۹۷۰ء

۱۸۔ اُردو کا کلاسیکی ادب: ڈرامے جلد ہفتم، نہم تا سیز دہم، ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۶ء
۱۹۔ اقبال — معاصرین کی نظر میں، ۱۹۷۳ء
۲۰۔ ماڈرن اُردو شارٹ اسٹوریز فرام پاکستان، ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۱ء
۲۱۔ اقبالیات کا مطالعہ، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۹۷۷ء
۲۲۔ فورٹ ولیم کالج، مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ۱۹۸۶ء

بعض قابلِ ذکر تراجم:

۱۔ دنیا کی مختصر تاریخ، ایچ۔ جی۔ ویلز، الٰہ آباد، ۱۹۳۸ء
۲۔ ہندوستان، پانچ ہزار سال پہلے، ۱۹۴۲ء
۳۔ تلاشِ ہند، جے۔ ایل۔ نہرو، دہلی، ۱۹۴۵ء
۴۔ ہندوستان کا اتحاد، دہلی، ۱۹۴۶ء
۵۔ الحمرا کی داستانیں، لاہور، ۱۹۵۹ء
۶۔ آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین، لاہور، ۱۹۵۹ء
[طبع دوم: آزاد تعلیم اور تہذیبِ نفس، لاہور ۱۹۶۳]
۷۔ مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی، لاہور، ۱۹۵۹ء
۸۔ بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو، لاہور، ۱۹۵۹ء
۹۔ امریکی ناول اور اس کی روایت، لاہور ۱۹۶۲ء
۱۰۔ ایمرسن کے مضامین، لاہور، ۱۹۶۲ء
۱۱۔ بچوں کو بہتر بول سکھائیے، لاہور، ۱۹۶۳ء
۱۲۔ مطالعے کے بہتر طریقے، لاہور، ۱۹۶۳ء
۱۳۔ آئیے دوست بن جائیے، لاہور، ۱۹۶۳ء
۱۴۔ بچے کی جماعتی زندگی، لاہور، ۱۹۶۳ء
۱۵۔ دوست بنانا اور دوستی نبھانا، لاہور، ۱۹۶۴ء
منطقِ فکر کی طرف رہنمائی، لاہور، ۱۹۶۴ء

۱۷۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے مسائل، لاہور، ۱۹۶۹ء

وضعِ اصطلاحات (با اشتراک):

۱۔ اصطلاحاتِ معاشیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۶ء
۲۔ اصطلاحاتِ سیاسیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۸ء
۳۔ اصطلاحاتِ نفسیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۱ء
۴۔ اصطلاحاتِ اطلاقی نفسیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۲ء
۵۔ دفتری اصطلاحات و محاورات کی لغت (انگریزی۔اردو)
حکومتِ پنجاب، لاہور، جون ۱۹۷۶ء

تاریخِ وفات: ہاجرہ میموریل کلینک، لاہور۔ ۱۷۔ نومبر ۱۹۷۶ء

قطعۂ تاریخِ وفات: (از: احسان دانشؔ، بفرمائش اقبال عظیم):

آبدیدہ ہوئے خبر پا کر — جن میں تھا فطرتاً مذاقِ سلیم
منہ سے نکلا خدا اُسے بخشے — اپنے الطاف سے بہشتِ نعیم
دانشؔ، اقبال کے کہا رو کر — لکھیے اک، نوحۂ وقارِ عظیم
۱۳۹۶ھ

نوحہ + وقارِ عظیم
۶۹ + ۱۳۲۷ = ۱۳۹۶
عمر + ہجری سالِ ولادت = ہجری سالِ وفات

غمِ مرگ:

برادرم معین صاحب — وقار صاحب کا غم، آپ سے کیسے اُٹھائے اُٹھے گا؟ میں آج، جب تعزیتی جلسے میں کچھ کہنے کھڑا ہوا تو کچھ نہ کہہ سکا، ہچکی بندھ گئی — ہم شاید اُن لوگوں میں سے ہیں جنھیں، اُنھوں نے، اپنے ہاتھ سے آخری چائے پلائی تھی، اور کس طرح لہک لہک کر باتیں کر رہے تھے — ایک ہفتہ بھی تو نہیں ہوا۔ سوچتا ہوں تو رونا آتا ہے۔ آپ کو صبر کی تلقین کیسے کروں اور کیا لکھوں؟

کراچی، ۱۸۔ نومبر ۱۹۷۶ء —————— ڈاکٹر فرمان فتح پوری

برادرِ مکرم معین صاحب — ابھی ابھی وقارِ عظیم صاحب کے انتقال کی خبر سُنی - اس خبر نے دل و دماغ پر جو اثر کیا ناقابلِ بیان ہے۔ افسوس کہ ہمارے درمیان سے ایک ایسا شخص اُٹھ گیا جو نیکی اور شرافت کا مرقع تھا، علم و فضل کا پیکر تھا، نرم مزاجی اور دلنوازی میں اپنی مثال آپ تھا، جس کی تحریر و تقریر سے شاید ہی کسی کو تکلیف پہنچی ہو —— ایسی جامع حیثیات شخصیت کا اُٹھ جانا ہماری بدقسمتی ہے —— ہم ایک ایسے معاشرے میں سانس لے رہے ہیں جس میں اچھے لوگ بہت کم ہیں۔ جب کوئی اچھا آدمی دنیا سے اُٹھتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سی اچھائیاں اُٹھ گئی ہوں - وقارِ عظیم صاحب کے ساتھ بہت سی اچھائیاں اُٹھ گئیں۔ اب ان اچھائیوں کے صرف تذکرے سُننے میں آئیں گے، چلتی پھرتی تصویر نظر نہ آئے گی —— مرحوم سے میرے رسمی مراسم تھے۔ کبھی کبھا ملاقات ہو جاتی تھی - گاہے گاہے خطوں کا تبادلہ ہو جاتا تھا —— جب مجھے اُن کی موت کا اتنا غم ہے تو سوچتا ہوں، آپ کا کیا حال ہو گا ؟

کراچی، ۱۸- نومبر ۱۹۷۶ء —— مُشفق خواجہ

سیرت و کردار :

میں نے اپنی زندگی میں جن بے شمار ادبا و شعرا اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کی ہے اُن میں سید وقارِ عظیم کو ایک فردِ یگانہ پایا۔ پچیس برس تک وہ میرے رفیقِ کار رہے میں نے انہیں بڑا رازدار اور رازداں پایا۔ زندگی میں میں نے جس چیز کے بارے میں اُن پر اعتماد کیا، اُنہیں اس میں پُورا اُترتا دیکھا۔ وہ صحیح معنوں اپنے نام کی مناسبت سے ایک باوقار آدمی بھی تھے اور ایک عظیم آدمی بھی

—— ڈاکٹر سید عبد اللہ

ہمارے ادبی اکابرین میں حالی سا فرشتہ سیرت انسان کم از کم میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ سید وقارِ عظیم کو بھی میں نے کبھی کسی کو بُرا کہتے نہ سُنا۔ اپنی رائے ایسے پیرائے

میں ظاہر کرتے تھے کہ چبھن محسوس نہ ہو۔ ہم کبھی کوئی بات کہہ بھی دیں تو ہاتھ کی ایک مثالی جنبش سے مسکرا کر ٹال دیتے۔ درگزر اُن کی طبیعت کا جوہر تھا۔

—— ابنِ انشا

"وقارِ عظیم صاحب کے کردار کی ایک بات اُن کی خاص طرح کی وضعداری تھی اور اس وضعداری نے بہتوں کو ان کے حق میں کر دیا تھا۔ یوں تو زندگی میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے کوئی ایسا آدمی نہیں جسے اس طرح مدّوجزر سے سابقہ نہ پڑا ہو لیکن وقارِ عظیم صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ کبھی غصے میں نہیں آتے تھے کبھی تلخ اور تند بات نہیں کہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے مخالفین بھی (اگر وہ کوئی ہوں تو) کسی نہ کسی طور پر اُن سے مفاہمت ضرور کر لیتے تھے اور اس میں وقارِ عظیم صاحب کے کردار کا۔ اُن کے خلوص کا اور ان کے انسانی پہلو کا دخل تھا اور یہ وہ چیز ہے جو بہت کم لوگوں میں ملے گی۔"

—— ڈاکٹر وحید قریشی

سید وقارِ عظیم، صرف ایک بڑے مصنف، ایک بڑے مدیر، ایک بڑے معلم، ایک بڑے مقرر اور ایک بڑے نقادِ ادب ہی نہیں تھے بلکہ شاید ان سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑے انسان بھی تھے —— ہر لحاظ سے — ہر مفہوم میں ایک بہت بڑے شریف انسان!

—— (مولانا) حامد علی خاں

وقارِ عظیم صاحب بڑے کریم النفس انسان تھے۔ وہ چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ اُنہیں پناہ دیتے، دل دہی کرتے اور ہر ممکن امداد و اعانت کے لیے وقت تیار رہتے تھے۔ اُن کی آغوش میں رحمت تھی۔ اُن سے اپنا دکھ سکھ بیان کرنے کے معنی یہ تھے کہ اب ساری ذمہ داری اُن کی اور سہولت و سُرخروئی مدد لینے والے کی!

—— پروفیسر مُشرف انصاری

میں نے وقارِ عظیم صاحب کی اس اخلاقی خوبی کا ہمیشہ مشاہدہ کیا ہے کہ وہ اپنی پسندیدگی کے اظہار میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ بعض اوقات دوسروں کی حوصلہ افزائی کے لیے استحقاق سے زیادہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اُنہوں نے کسی کا دل

نہیں توڑا مگر ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ضرور بنے ۔"

———— ۔ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

وقارعظیم صاحب کی انسانیت ۔ وضع داری اور ادبی انہماک کی میرے دل میں
بڑی قدر تھی ۔ اُنہوں نے بڑی بامعنی زندگی گزاری — جو چیزیں اُنہیں عزیز
تھیں، اُن کا حق پورے لگاؤ اور لگن کے ساتھ آخر دم تک ادا کرتے رہے اور
بڑا پاک صاف نقش لوگوں کے دلوں پر چھوڑ گئے"۔

———— خواجہ منظور حسین

وقارعظیم نے ادب کے لیے جو کچھ چھوڑا ، وہ یقیناً یادگار رہے گا لیکن دلوں میں
جو نقش چھوڑے ہیں وہ بھی کیوں کر محو ہو سکیں گے ؟

———— ڈاکٹر غلام مصطفٰی خاں

ادبی مقام و مرتبہ :

"کچھ نقاد ہیں جو نہ زیادہ مغرب زدہ ہیں، نہ اشتراکی اور نہ مارکسی نظریے
سے مغلوب، اُنہوں نے مغرب کے اثر میں آکر مشرقی اصول اور تنقید کو ترک
نہیں کیا ۔ ان کی تنقید میں توازن اور اعتدال ہے، انتہا پسندی نہیں —
وقارعظیم اسی قسم کے نقاد ہیں ۔"

———— بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"سید وقارعظیم کا اصلی کارنامہ جس کے لیے وہ تاریخ ادب اُردو میں یاد کیے جائیں گے،
اُن کی تنقید ہے، خاص طور پر افسانے میں تو اُن کا نام اتنا نمایاں ہے کہ شاید ہی
کوئی نقاد اُن کی ہم سری کا دعویٰ کر سکے : اگرچہ اور بہت اصحاب نے بھی افسانے
کی تاریخ و تنقید پر لکھا ہے مثلاً احتشام حسین اور احسن فاروقی — مگر بحیثیتِ مجموعی
وقارعظیم کا پلہ سب پر بھاری ہے ۔"

———— مالک رام

"وقارعظیم فکشن کے نقاد کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں احترام
کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ انہیں اُردو نثر کا پہلا نقاد کہنا چاہیے افسانے
اور ناول پر تو متعدد حضرات لکھتے رہے ہیں لیکن وہ پاکستان کے واحد ادیب
تھے جنہوں نے داستانوں پر بھی توجہ صرف کی اور اس طرح داستان پر لکھنے
والوں میں اُن کا نام کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر گیان چند کے ساتھ لیا جائے گا ۔
— تاہم اس اعتبار سے وہ امتیاز رکھتے ہیں کہ داستانوں کے ساتھ ساتھ
انہوں نے ناول اور افسانے پر بھی کام کیا اور اُردو فکشن کے بارے میں
ایک جامع تنقیدی نظر پیدا کی ۔ — اسی جامعیت کی وجہ سے اُردو فکشن
کے نقاد کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان میں ان کا مدتوں کوئی ثانی
نہیں رہا — اُن کی تحریریں، ان کی یاد کو زندہ رکھیں گی ۔"

———— ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سید وقارعظیم نے زیادہ تر کام، اُردو افسانے پر کیا، داستانوں پر کیا ۔
موضوع اپنے لیے مختص کر لیا ۔ ہر چند کہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی
کتابیں لکھیں، حق بھی ادا کیا مگر داستانوں اور اردو افسانے پر تو اُن
کی تحریریں اتھارٹی کی حیثیت رکھتی ہیں — نثر نویسی میں یہ بڑا ٹیڑھا
کام تھا ۔ آج زیادہ تر نقاد شاعری کے ملتے ہیں ۔ ہر کسی کے لیے شاعری کا
پڑھنا، اس سے حظ اُٹھانا، روزمرہ کا شغل ٹھہرا — مگر داستانوں
کا پڑھنا اور تنقیدی نظر سے پڑھنا، شغل نہیں جان جوکھوں کا کام ہے ۔ انہوں
نے اپنی ریاضت کے سلسلے میں آسان راہ کی طرف دھیان نہ دیا، مشکل راہ اختیار
کی ۔ اگر (بطور) ناقد، سید وقارعظیم اردو افسانے کو نہ ملتے تو آج افسانہ اتنا
ترقی یافتہ کبھی نہ ہوتا ۔

محمد طفیل / محمد نقوش

"وقار عظیم نے افسانوی ادب کا شروع ہی سے وسیع مطالعہ کیا تھا۔ بالآخر اُنہوں نے اس فن میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ بلا تکلف اُن کو اس کا ایک مسلم الثبوت اُستاد کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برِصغیر پاک و ہند میں اس فن میں جو مقام اُن کو حاصل تھا وہ کسی کو بھی حاصل نہیں۔

——— ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں

افسانے، داستان اور فکشن پر اُردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں وقار عظیم صاحب کی تحریریں سب سے ممتاز و منفرد ہیں۔ وقار صاحب اُردو کے وہ نقاد ہیں جنہوں نے اُردو افسانے اور فکشن کو ایک باوقار اور سنجیدہ صنفِ ادب بنانے میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

——— ڈاکٹر جمیل جالبی

"افسانے کی تاریخ و تنقید کے علاوہ 'اقبالیات' وقار عظیم کا دوسرا تخصیصی میدان تھا۔ قیامِ پاکستان کی پہلی چوتھائی صدی کے نامور ترین اقبال شناسوں میں 'اپنی مانوس خوش بیانی اور منطقی خوش استدلالی کے باعث' وہ ہمیشہ متاثر اور ممتاز رہے۔ پنجاب کی نئی نسل میں اقبالیات کا ذوق پیدا کرنے اور اقبال شناسی کی فضا پیدا کر دینے میں بھی پروفیسر سید وقار عظیم کا قابلِ فخر حصہ اور قابلِ رشک دخل رہا ہے ——— ۱۹۷۱ء میں وہ پنجاب یونیورسٹی سے قریب اکیس برس کی منصبی وابستگی کے بعد سبکدوش ہوئے۔ اُن کے عینِ حیات پاکستان اور بھارت کی کسی بھی یونیورسٹی کے کسی بھی اُستاد نے اقبال پر وقار عظیم سے زیادہ تحقیقی کام کی نگرانی اور رہنمائی کی خدمت انجام نہیں دی۔"

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

وقار عظیم کی شہرت کی ابتدا اُن کی پہلی کتاب "اُردو افسانہ" سے ہوئی۔ اِدھر ان کے متفرق تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فن اور فن کار" اور اقبال پر ان کی کتاب "اقبال ——— شاعر اور فلسفی" منظرِ عام پر آئی۔ "اقبال ——— معاصرین کی نظر میں" کے نام سے ان کا ترتیب دیا ہوا ایک اچھا مجموعۂ مضامین بھی چھپا ہے۔ اُن کی پہلی برسی پر اُن کے رفیقِ دیرینہ

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اقبال پر وقار عظیم کے غیر مرتب اور غیر مطبوعہ مضامین کا ایک عمدہ مجموعہ "اقبالیات کا مطالعہ" شائع کیا۔ ان کی موضوعی مرکزیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ناپ تول کر لکھنے والوں میں تھے۔ اس مرکزیت، لگن اور مسلسل کام سے انہوں نے اقبالیات میں اہم مقام حاصل کیا۔

——— ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

محنت وقار عظیم صاحب کی زندگی کی کامیابی کا جوہر تھا۔ مستقل مزاجی نے اس میں رنگ بھرے تھے۔ وہ جس کام پر لگتے اُسے نہایت ذمہ داری، تن دہی اور توجہ سے انجام تک پہنچاتے۔ کئی سال سے اُردو اصطلاحات پر کام کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ وفات سے چند ہفتے پہلے یہ کام نہ صرف مکمل ہو گیا بلکہ چھپ کر بھی سامنے آ گیا ——— میں اس کام کو وقار عظیم صاحب کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتا ہوں۔"

——— ڈاکٹر جمیل جالبی

"مشرق اور مغرب ہر دو کے علمی سرمائے سے باخبر، خوش مزاج اور تازہ کار ناقدینِ ادب کے اس گروہ میں جس کا سلسلہ رشید احمد صدیقی اور علی عباس حسینی سے شروع ہوتا ہے، وقار عظیم صاحب کا نام اور مقام بہت بلند ہے ——— اس شہرت سے ان کی ادبی حیثیت اور قامت کا ایک پہلو جس کا تعلق دریافت و بازیافت سے ہے، قدرے دب گیا ہے۔ وہ قدرِ اوّل کے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ محقق بھی تھے۔ اُن کی تنقید میں اچھی خاصی 'ریسرچ ورک کی شان' ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک معتبر اور ذمہ دار نقاد اور محقق اور تازہ واردانِ بساطِ ادب و تحقیق کے لیے ایک منارۂ نور اور خضرِ خجستہ گام کی حیثیت رکھتے تھے۔"

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

"محقق ہونے کا میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن تنقید میں اگر میری بات سُنی جاتی ہے اور پسند کی جاتی ہے تو ہر تنقید کے پیچھے تھوڑی بہت تحقیق ضروری ہے۔ کوئی نقاد صحیح تنقید اُس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کا مزاج تحقیقی بھی نہ ہو۔"

——— سید وقار عظیم

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اقبال پر وقار عظیم کے غیر مرتب اور غیر مطبوعہ مضامین کا ایک عمدہ مجموعہ "اقبالیات کا مطالعہ" شائع کیا۔ ان کی موضوعی مرکزیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ناپ تول کر لکھنے والوں میں تھے۔ اس مرکزیت، لگن اور مسلسل کام سے انہوں نے اقبالیات میں اہم مقام حاصل کیا۔

——— ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

محنت، وقار عظیم صاحب کی زندگی کی کامیابی کا جوہر تھا۔ مستقل مزاجی نے اس میں رنگ بھرے تھے۔ وہ جس کام پر لگتے اُسے نہایت ذمہ داری، تن دہی اور توجہ سے انجام تک پہنچاتے۔ کئی سال سے اُردو اصطلاحات پر کام کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ وفات سے چند ہفتے پہلے یہ کام نہ صرف مکمل ہو گیا بلکہ چھپ کر بھی سامنے آ گیا۔ میں اس کام کو وقار عظیم صاحب کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتا ہوں۔"

——— ڈاکٹر جمیل جالبی

"مشرق اور مغرب ہر دو کے علمی سرمائے سے باخبر، خوش مزاج اور تازہ کار ناقدینِ ادب کے اس گروہ میں جس کا سلسلہ رشید احمد صدیقی اور علی عباس حسینی سے شروع ہوتا ہے، وقار عظیم صاحب کا نام اور مقام بہت بلند ہے — اس شہرت سے ان کی ادبی حیثیت اور قامت کا ایک پہلو جس کا تعلق دریافت و بازیافت سے ہے، قدرے دب گیا ہے۔ وہ قدرِ اول کے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ محقق بھی تھے۔ اُن کی تنقید میں اچھی خاصی 'ریسرچ ورک کی شان' ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک معتبر اور ذمہ دار نقاد اور محقق اور تازہ واردانِ بساطِ ادب و تحقیق کے لیے ایک مینارۂ نور اور خضرِ خجستہ گام کی حیثیت رکھتے تھے۔"

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

"محقق ہونے کا میں دعویٰ نہیں کرتا لیکن تنقید میں اگر میری بات سُنی جاتی ہے اور پسند کی جاتی ہے تو ہر تنقید کے پیچھے تھوڑی بہت تحقیق ضروری ہے۔ کوئی نقاد صحیح تنقید اُس وقت تک کر ہی نہیں سکتا جب تک اس کا مزاج تحقیقی بھی نہ ہو۔"

——— سید وقار عظیم